خواجہ عبدالرزاق کھڑگپوری

خواجہ عبدالرزاق کھڑگپوری

یہ کتاب فخرالدّین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومت اترپردیش لکھنؤ کے مالی تعاون
سے شائع ہوئی

خواجہ عبدالرزّاق کھڑگپوری

منتخب افسانوں کا مجموعہ

تنہائیوں کا دلچسپ ساتھی

دور کے پہاڑ

نام کتاب	دور کے پہاڑ
سال اشاعت	۱۹۹۴ء
تعداد	چار سو
سرورق	شیخ حکیم
طباعت	مرینا پرنٹرس، کلکتہ
کتابت	محمد واجد، ہوڑہ
ناشر	خواجہ عبدالرزاق کھڑگپوری
قیمت	تیس روپے

Rs 30/=

ملنے کے پتے:

نمبر 119 ایل ٹو۔ اسٹریٹ مائیل روڈ
سابچی، جمشید پور ۱

نمبر ۱۰ ایل ون، کالی ماٹی روڈ
سابچی، جمشید پور ۱

پیش کش

شفیق النساء زریںؔ

افسری کے نام

کل کائنات کا مجھے مل جائے اختیار

سارے جہاں کی نیکیاں لکھدوں تمہارے نام

سوز کھڑگپوری

جناب ناقد نظمی صاحب

اور

جناب خواجہ عبدالجبّار صاحب

جنکا بے لوث تعاون
کتاب کے
آخری مرحلہ تک رہا

فہرست

دور کے پہاڑ

صفحہ نمبر

بات چھوٹی سی	۱۳
دور کے پہاڑ	۱۸
مینا رگر پڑا	۲۵
سرد شعلے	۳۲
صبح کا بھولا	۳۸
دکھ سکھ	۴۶
پیٹ کا سوال	۵۳
دھوپ چھاؤں	۵۹
ماماتا کی بجلی	۶۶
آخری فیصلہ	۷۴
بات کہاں ٹھہری	۸۴
خط کا کرب	۹۱

دور کے پہاڑ ایک ذہین فنکار کے فکر واحساس کی جدتوں، تجربات اور مشاہدات کے جزیروں پر محیط ہیں، اس نے اپنے فن کے آبگینوں کی تراش خراش اور ان کی آب و تاب نکھارنے میں بڑے خلوص اور ایمانداری کا حق ادا کیا ہے۔

خواجہ عبدالرزاق ایک کہنہ مشق اور سلجھا ہوا افسانہ نگار ہے۔ میں نے اس کے کئی افسانے پڑھے ہیں۔ اس کا مخصوص لب ولہجہ اور اچھوتا اسلوب دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اس کا چونکا دینے والا انداز ایک منفرد تخلیق کار کی عکاسی کرتا ہے۔

حسن نجمی سکندر پوری

اپنی بات

اگرچہ میرا ادبی ذوق شعر و شاعری سے شروع ہوا لیکن یہ مجھے راس نہیں آیا۔
پھر میں نے افسانہ نگاری کو ترجیح دی۔
یقین جانئے۔
جس وقت مجھے افسانہ نگاری کا روگ لگا۔
اس وقت جمشید پور جیسے ترقی پذیر شہر کے ادبی حلقوں میں اس مرض کا کوئی علاج نہیں تھا۔
لیکن میرے حوصلے سیماب صفت اور بلند تھے لہٰذا میں مسلسل لکھتا رہا اور اپنے احباب کو سناتا رہا، لیکن اس کے باوجود،
مجھے ایک عجیب احساس کمتری محسوس ہوتا رہا اور
ایسا لگ رہا تھا کہ
میرے افسانوں کے خدوخال میں وہ حسن اور دلکشی نہیں ہے جو ایک صحیح افسانہ نگار کی پہچان ہوتی ہے۔
میں اسی کشمکش و پیچ کی لہروں میں غوطہ زن تھا، آخر کار میں نے ایک طویل دلچسپ افسانہ کوئی سولہ صفحات پر مشتمل برصغیر کے نامور افسانہ نگار قیصی رام نگری کی خدمت میں پیش کیا۔
موصوف نے اس افسانے پر جس انداز سے نقطے لگائے کہ وہ حقیقت

میں میرے لیے چراغِ منزل ثابت ہوئے۔
پھر میں اس منزل کیطرف
دوڑا ہی نہیں بلکہ اڑنے لگا۔
واضح رہے۔
وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔
اس ضمن میں بالخصوص
محترم خوشتر گرامی (ایڈیٹر بیسویں صدی، دہلی)
محترم محشر دہلوی عربک (ایڈیٹر فنکار اور حشر، بمبئی)
اور جناب کامدار الدنی (ایڈیٹر عنبر، بنگلو)
کا میں اپنے دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں۔
آپ حضرات نے میرا بہت حوصلہ بڑھایا۔
مگر میں جناب احمد سعید ملیح آبادی کو کبھی نہیں فراموش کر سکتا۔
آپ نے اجالا کلکتہ کے ذریعہ مجھے ملک کے بیشمار ادبی حلقوں سے
روشناس کرایا۔
یقین کیجئے۔
میرے تمام افسانے
مشاہدات، واقعات اور حادثات پر مبنی ہیں۔
اس مجموعہ میں آپکو
تقریباً ہر موضوع پر افسانے ملیں گے۔
سماجی، معاشرتی اور اقتصادی وغیرہ
جو عوامی زندگی کے مختلف کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔
آخر میں۔
ایک حقیقت کا اظہار کر دوں۔

"دکھ سکھ" اور "بات چھوٹی سی"

یہ محض افسانے ہی نہیں ہیں، ایک یادگار حقیقت ہے۔ انہیں آپ میری سرگزشت بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہ میرے کردار کی پرچھائیاں ہیں۔

خواجہ عبدالرّزاق کھڑگپوری
ایل ٹو ۱۱۹، اسٹریٹ مائل روڈ
ساکچی، جمشید پور

بات چھوٹی سی

زندگی میں کبھی ایسا کبھی واقعہ ہوتا ہے جسکو انسان عمر بھر نہیں بھولتا۔ ایک سال بعد بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا، وہ کسی بھی بات کا جواب نہایت محتاط انداز میں دیا کرتی تھی۔

چھ بج چکے تھے، شام کے ملگجے سائے اپنے پاؤں پھیلاتے جارہے تھے، وہ دروازے پر کھڑی اضطراب کے عالم میں دور دور تک نظریں دوڑارہی تھی۔ اس کے بچے اب تک اسکول سے نہیں آئے تھے، اس کے دماغ میں مختلف وسوسے تڑپ رہے تھے۔ گھر میں کوئی تھا بھی نہیں جسے پتہ لگانے اسکول بھیجا جاتا، وہ بری طرح بیقرار ہو رہی تھی۔

اتنے میں ریاض اپنی سائیکل گھسیٹتا ہوا دفتر سے پیدل آتا دکھائی دیا۔ راستہ میں اس کی سائیکل پنچر ہوگئی تھی۔ وہ جمیلہ کو خلاف معمول دروازے پر کھڑی دیکھ کر چونکا۔ قریب آکر پوچھا کیا ہوا، کیوں کھڑی ہو؟"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جمیلہ نے گلوگیر آواز میں کہا "بچے اسکول سے اب تک نہیں آئے۔"

"بچے اب تک نہیں آئے! ریاض یکبارگی بدحواس ہوگیا اور سائیکل پٹخ کر الٹے پاؤں بھاگا۔ مشکل سے بیس قدم بھی نہیں گیا ہوگا کہ بچوں کا رکشہ آتا دکھائی دیا۔

رکشا گھر پر پہنچا تو جمیلہ نے رکشے والے سے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ "اتنی دیر کیوں ہوئی رکشے والے؟ اس سے قبل کہ رکشے والا کچھ کہتا، بچوں نے رکشے سے اترتے ہوئے کہا "آج کارپوریشن کے میئر صاحب اسکول کا معائنہ کرنے آئے تھے، اس لئے چھٹی دیر سے ہوئی۔"

ان کا جواب سنکر جمیلہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ کم ہوئیں اور دونوں بچوں کو اپنی ممتا بھری باہوں میں سمیٹے اندر چلی گئی۔

ریاض سگریٹ پیتے ہوئے کل کا اخبار دیکھ رہا تھا اور کبھی کبھی جھجکتی نظروں سے جمیلہ کیطرف دیکھ بھی لیتا تھا جو چائے بنانے میں مصروف تھی۔ چنداں توقف کے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "جمیلہ کل ہم لوگ فلم دیکھنے چلیں گے۔" کچھ دیر رک کر اس نے پھر کہا "سنا تم نے"۔

"سن رہی ہوں ــــ"

"کریم ٹاکیز میں پاکیزہ چل رہی ہے، سارے شہر میں اس کا چرچا ہے۔"

"لیکن میں نہیں جا سکوں گی، تم جانا چاہو، تو ہو آؤ" اس کے سنجیدہ چہرے پر اندرونی کشمکش کے تاثرات نمایاں تھے۔ اسے اپنی حق تلفی کا شدید احساس تھا۔

اس کا روکھا جواب سن کر ریاض کا دل پانی میں بتاشے کیطرح بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ دل شکستہ لہجہ میں بولا۔

"جمیلہ، ایک سال کے بعد بھی تمہارا مزاج نہیں بدلا۔ آخر تم کسی بات کو کب تک گرہ باندھ کر رکھو گی، میں نے تمہارے وقار کے خلاف کوئی بات نہیں کہی تھی"۔

"جمیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اسکی ہمیں جیسی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

ریاض گہری سوچ میں پڑ گیا شاید اس نے ناسمجھی میں کوئی بات کہدی ہو جسے وہ برداشت نہیں کر سکی۔ وہ میز پر اخبار رکھ کر بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ جمیلہ کے پاس آیا اور نہایت خفیف لہجہ میں کہا۔

"جمیلہ یقین مانو، میرا کوئی برا خیال نہیں تھا۔ وہ ایک عام بات تھی، تم نے فضول کا برا اثر لے لیا، خیر میں اپنی بات واپس لیتا ہوں، تم بھی اسکو اپنے ذہن سے نکال دو" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پھر انتہائی شکستہ لہجہ میں کہا۔

"خیر اب تو میرے ساتھ فلم دیکھنے چلوگی نا؟"

"نہیں ـــ میں نہیں جا سکوں گی"۔ دراصل وہ ریاض کی شکی طبیعت سے خائف تھی۔ اس کا دماغ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکا تھا

جمیلہ کی ہٹ دھرمی پر ریاض غصہ سے تلملا اٹھا۔ اس کے اندر غیر شعوری طور پر انتقامی جذبہ ابھرنے لگا، لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکا چپ چاپ جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

ہڑتال کی وجہ سے فیکٹری اور تمام دفاتر کوئی دو مہینے سے بند تھے۔ انتظامیہ اور ملازمین کے درمیان بحث مباحثہ کے کئی دور ہوئے لیکن کوئی خاطر خواہ حل نہیں نکل سکا، دونوں حریف اپنے اپنے رویئے میں ذرا بھی لچک پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے، انتظامیہ نے ہڑتال توڑنے کیلئے دلالوں کو بھی استعمال کیا لیکن اس میں بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی بلکہ معاملہ اور الجھ گیا، آخر کار سرکار کو اس معاملے میں مداخلت کرنا پڑی، کافی جدوجہد کے بعد کچھ دو اور کچھ لو کی بنیاد پر دونوں کے درمیان سمجھوتہ ہو سکا۔ انتظامیہ نے فیصلہ میں احتیاطاً کچھ ضروری شرائط بھی رکھی تھیں جن کی رو سے لیڈر ٹائپ ملازمین جو ہڑتال کے دوران پیش پیش تھے انہیں مزید ایک مہینہ کیلئے معطل کر دیا گیا۔ اس زمرے میں ریاض کا بھی نام تھا۔

ویسے شروع ہی سے ریاض کو ہڑتال کی صعوبتوں کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اور ہوتا بھی کیوں اسکی بیوی ایک باشعور اور سلیقہ مند خاتون تھی، گھر گرہستی کے معاملات میں وہ اچھی خاصی مہارت رکھتی تھی۔ ہڑتال کی ساری مدت میں اس نے اپنی ضروریات زندگی کے کسی گوشے میں فرق آنے نہیں دیا۔ معمول کے مطابق وہ صبح سویرے اپنے بچوں کو تیار کر کے ان کو ٹیوشن کے ساتھ اسکول روانہ کر دیتی۔ ادھر ریاض ناشتہ کر کے صبح

جاتا تو شام کو آتا۔ جمیلہ اکیلی گھر کے تمام کام کاج کا نپٹارہ کرکے پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ سنٹر چلی جاتی جہاں وہ لڑکیوں اور عورتوں کو کشیدہ کاری، موتیوں اور تاروں سے زیورات بنانے کے علاوہ کپڑوں کی کٹنگ اور سلائی بھی سکھاتی تھی۔ اس کو سرکار کی طرف سے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی، مگر جو تنخواہ اسکو ملتی تھی اس سے اسکے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوپاتے تھے، اسے بعض اوقات قرض بھی لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کے دونوں بچے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے اسکول کی فیس کے علاوہ کتابیں، کاپیاں، پین، پنسل وغیرہ کے اخراجات بھی تھے اس کے علاوہ اس نے اپنے زیورات بھی گروی رکھ دیئے تھے۔

معطلی کی مدت ختم ہو چکی تھی، ریاض اب دفتر جانے لگا تھا، ایک دن جب وہ دفتر سے آرہا تھا تو راستہ میں چودھری مہاجن مل گیا۔ اسنے سلام بجا لاکر کہا۔

" ریاض بابو، آپ کی پتنی سونے کی دو انگوٹھیاں گروی رکھ کر گئی تھیں اور یہ کہکر گئی تھیں کہ پندرہ دن بعد چھڑا لوں گی، مگر دو مہینے ہوگئے، وہ اب تک نہیں لے گئیں۔ آپ ذرا انہیں یاد دلا دیجئے گا۔"

ریاض نے جواب میں کچھ نہیں کہا، صرف اثبات میں سر ہلا کر چل دیا۔ گھر آکر دفتر کے کپڑے اتارے بغیر اس نے جمیلہ کو آواز دی۔ اس وقت جمیلہ بچوں کے اسکولی کپڑے اتار رہی تھی۔ اس نے مصروفیت میں کہا "آرہی ہوں......"

بچوں کو ناشتہ دیکر وہ ریاض کے پاس گئی۔ ریاض کا موڈ الجھا ہوا دیکھکر اس نے کہا۔ "کیا تم خفا ہو؟"

چودھری مہاجن کی بات اسکو بار بار ریچھو کے لگا رہی تھی۔ اس نے بے ضبط ہوکر سخت لہجہ میں کہا۔

"جانتی ہو، آج چودھری مہاجن نے راستہ میں مجھے بے عزت کر دیا۔ بتاؤ تم نے کیا کیا زیورات کس کس کے یہاں گروی رکھے ہیں؟"

"آج تم کو احساس ہو رہا ہے۔ پچھلے تین مہینے کس طرح گزرے، کبھی پوچھا تھا؟ گھر کے اخراجات کس طرح پورے ہو رہے ہیں؟ آج تمہارے دل میں درد اٹھا ہے؟

"دیکھو میں فضول باتیں سننا نہیں چاہتا ہوں"

"کیوں، تم کو کس بات کا شک ہے؟"

"گھر کے خرچ کا حساب جس دن سے تم نے خانہ داری سنبھالی ہے۔"

جمیلہ کے سنجیدہ چہرے پر یکلخت حقارت آمیز تاثرات پھیل گئے۔ اس کے زردہ ہونٹ کچھ کہنے کو کپکپا اٹھے لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی ریاض گرج اٹھا۔

"دیکھو، اپنی چالاکی رہنے دو۔ مجھے حساب چاہئے روزانہ خرچ کا حساب۔"

جمیلہ کچھ دیر تک خاموش، اس کے سراپا کو گھور کر دیکھتی رہی پھر بے قابو ہو کر بولی۔

"کیا تمہیں علم نہیں کہ تمہاری تین مہینے کی بیکاری میں گھر کے اخراجات کس طرح چل رہے تھے؟ اگر کچھ اور کہنا ہو تو کھل کر کہو، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ اپنے گھر کی عزت اور وقار کو برقرار رکھنے کی ہر امکانی کوشش کی ہے" پھر وہ فوراً جاکر باورچی خانے سے اپنے حساب کی کاپی اٹھا لائی اور ریاض کے سامنے اچھال دی اور بھیگی آواز میں کہا۔

"لو، دیکھ لو ــــ"

اس کا گورا چہرہ غصہ کی تمازت سے گلنار ہو گیا۔

ریاض ایک محاسب کی طرح کاپی کے تمام اوراق الٹنے پلٹنے کے بعد سوچ رہا تھا۔ اتنے میں جمیلہ نے گروی رکھے ہوئے زیورات کے کاغذات اور کپڑوں کی خریداری کے حساب کی رسیدیں اس کے سامنے رکھ دیں۔

جمیلہ کے غصے سے تمتمائے ہوئے رعب دار چہرے پر درد، نفرت، کشمکش اور کرب ناک تاثرات کو دیکھ کر ریاض کی آنکھیں دھواں دھواں ہو گئیں۔

ــ•ــ

دور کے پہاڑ

کائنات کے آتے ہی دفتر میں خود بخود ڈسپلن آگئی اور کام باقاعدہ چلنے لگا۔ کام چور بابوؤں کے چہروں پر بھی تبسم کے کنول ناچنے لگے اور اپنے کاموں میں چاق و چوبند ہو گئے۔ گویا دفتر کا سارا اسٹاف انگریزوں کیطرح وقت کا پابند ہو گیا، چند دن پہلے اسی دفتر میں دھول اڑا کرتی تھی لیکن اب شاداب اور شگفتہ گلشن دکھائی دینے لگا اور روزانہ اگربتیوں کی روح پرور خوشبو بھی پھیلنے لگی تھی۔

شوکت آفس انچارج تھا، بڑے صاحب کے بعد دفتر کی تمام ذمہ داریاں اسی پر تھیں لیکن بدنصیبی سے وہ مالی اعتبار سے بالکل ٹوٹا ہوا تھا، اپنا غم غلط کرنے کی خاطر خالی وقت میں بددلی سے دفتر میں سگریٹ پی پی کر دن گذارتا تھا۔ تاہم اس حالت میں بھی وہ کائنات کی آمد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا رفتہ رفتہ اس کے پژمردہ چہرے پر مسکراہٹ کے جگنو چمکنے لگے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے کربناک دل میں مترنم سرگوشیاں مچل رہی ہوں دراصل کائنات تھی بھی ایسی باغ و بہار قسم کی لڑکی۔

وہ کوئی اٹھارہ انیس سال کی دھان پان سی حسین بھرپور جوان لڑکی تھی۔ اس کے دلکش چہرے کی شگفتگی ایسی تھی کہ آئینہ بھی شرما جائے۔ سولہ سنگار کے بغیر ہی اس کی موہنی صورت کا دل فریب عکس دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا تھا۔ اسکے

چہرے پر ہمیشہ ایک دل آویز تبسم اٹھکھیلیاں کرتا رہتا تھا۔

لیٹر ٹائپنگ کا مختصر کام پہلے شوکت ہی کر لیا کرتا تھا۔ مگر اب ٹائپنگ کا سارا کام کائنات کے سپرد کر دیا گیا، کیونکہ وہ اسی مقصد کے لئے بحال کی گئی تھی شوکت اگرچہ آفس انچارج تھا لیکن اسکی اقتصادی زندگی نہایت ناگفتہ بہ تھی، بے لوث بجھی بجھی سی۔ جیسے چولہے میں پڑی گیلی لکڑیاں دھیرے دھیرے سلگ رہی ہوں۔ وہ چار بچوں کا باپ تھا جن میں تین بڑی لڑکیاں اور ایک چھوٹا لڑکا تھا اس کے دل میں نہ کوئی ولولہ تھا نہ امنگ، اپنی تمام خواہشات کو مفلسی کے غار میں دفن کر دیا تھا۔ اس کے بیوی بچوں نے بھی بغیر کسی مزاحمت کے گھر کے موجودہ حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

۱۵ اگست چھٹی کا دن تھا۔ شوکت اپنے آفس بوائے ناصر کے یہاں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ناصر نے اسے خاص طور پر اپنے یہاں مدعو کیا تھا کیونکہ اسے جو ترقی ملی شوکت ہی کی کوشش سے ملی تھی۔ اس لئے ناصر نے بار احسان سے سبک دوش ہونے کے لئے اسے بلایا تھا۔ جب وہ ناصر کے گھر پہونچا تو اتفاقی طور پر اوپری منزل کی کھڑکی سے اس کی نظر ٹکرا گئی۔ کائنات کھڑکی کے سامنے بیٹھی اپنی زلفیں سنوار رہی تھی وہ کائنات کو گھور گھور کر دیکھنے لگا اور بار بار زاویہ بدل بدل کر دیکھتا رہا۔ جب کائنات اپنے ٹوٹے بال کنگھی سے نکال کر کھڑکی سے باہر پھینکنے کو مڑی تو اچانک اسکی نظر شوکت سے ٹکرا گئی اور عجیب انداز دلربائی سے اس نے کھڑکی بند کر لی۔ شوکت کو ایسا لگا جیسے سیاہ بادلوں میں بجلی تڑپ کر چھپ گئی۔ وہ محویت کے عالم میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ناصر باہر نکلا تو شوکت کو دیکھکر فوراً سلام کیا اور بڑے احترام سے اندر لے گیا۔ کمرے میں چھوٹی سی میز پر پر تکلف ناشتہ چنا ہوا تھا لیکن شوکت اپنی اضطراری کیفیت میں سکون سے کچھ نہیں کھا سکا اور معذرت چاہ کر واپس چلا گیا۔

رات دیر گئے تک وہ نہیں سو سکا، کائنات کا طلسم انگیز تصور اس کے ذہن کے لطیف تاروں پر زمزمہ بار تھا۔ اس کا دل مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ انسان کی آنکھیں دل کا آئینہ ہوتی ہیں، زبان جھوٹ بول سکتی ہے لیکن آنکھیں کبھی نہیں جھوٹ

بولیتی، یقیناً اس کی نرگسی آنکھیں محبت کا پیغام دے رہی تھیں۔ وہ ان ہی تخلیقات کے تانے بانے میں سو گیا۔

صبح سویرے اٹھا، جلدی جلدی شیو کر کے پرانے جوتوں پر پالش لگائی پھر نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے، شلف پر رکھا ہوا خوشبودار تیل بالوں میں لگا کر سلیقے سے کنگھی کی پھر معمول کے مطابق ناشتہ کر کے آفس چلا گیا۔

آج سب سے پہلے وہ دفتر پہونچ گیا اور میز پر پڑے ہوئے ضروری کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد دفتر کا تمام اسٹاف بھی آ گیا۔ کائنات کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر شوکت کی آنکھوں میں عجیب مسحور کن کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ اس توقع کے ساتھ اسے دیکھنے لگا کہ وہ بھی اسے ضرور دیکھے گی مگر کائنات روزمرہ کی طرح اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی اس بے حسی پر اس کا دل زخمی کبوتر کی طرح تڑپ گیا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد وہ نظریں بچا کر اس کو دیکھتا رہا۔ آخر شدت جذبات سے بے قابو ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور چند کاغذات لے کر اسکی میز کی طرف جانے لگا۔ دو ہی قدم چلکر وہ رک گیا اس کی ہمت جواب دے گئی۔ آخر مایوس ہو کر اپنی کرسی پر چلا آیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اتنے میں بڑے صاحب کے چیمبر کی گھنٹی بجی، کائنات عجیب نسوانی ادا سے اٹھ کر جانے لگی اور جاتے جاتے اخلاقاً شوکت کی طرف مسکراتے ہوئے چلی گئی، یکلخت شوکت کے دل میں جل ترنگ بج اٹھے۔ اسکی دزدیدہ نگاہیں کائنات کے تعاقب میں چیمبر کے دروازے تک جا کر رک گئیں۔

دوسرے دن بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کائنات کے نام ایک خط لکھ ڈالا۔ اور روزمرہ کی طرح لیٹر ٹائپ کرانے کے بہانے اس کی میز کی طرف جانے لگا مگر یک بیک اس کے قدم رک گئے اور دل دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دفتر کے تمام بابو اس کے ارادوں کو بھانپ گئے ہوں۔ وہ اپنی خفت چھپانے کی خاطر فوراً باتھ روم میں چلا گیا۔ چند اں توقف کے بعد باتھ روم سے باہر آیا اور پھر اسی جگہ آکر کھڑا

ہوگیا، اور اپنے منصوبے کو پروان چڑھانے کیلئے سوچنے لگا، لیکن بدحواسی میں اس کا دماغ ماؤف ہوگیا اور اس کے تمام حوصلے پانی میں تباشے کی طرح بیٹھ گئے۔

اب اس کی بے کیف زندگی میں رفتہ رفتہ تبدیلی آنے لگی تھی، دفتر جانے کے انداز بدل گئے تھے، وہ بہت سویرے دفتر چلا جاتا اور دیر سے واپس آتا تھا، ہر دو روز بعد کپڑے بدل لئے جاتے تھے، جوتوں پر پالش چڑھائی جاتی تھی، کپڑوں میں اکثر خوشبو بھی بسا لیتا تھا۔ غرض اپنی پوزیشن اور وقار کو جتانے کیلئے ہر انداز سے جتن کرتا تھا، اس دیوانگی میں اپنے بیوی بچوں کیطرف سے بے توجہی برتنے لگا تھا۔ اس غیر متوقع تبدیلی کو دیکھ کر اسکی بیوی نے ایک دن بے ضبط ہوکر اس سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے آجکل آپ بہت بن سنور کر رہنے لگے ہیں۔ کیا کوئی ترقی ملنے والی ہے"۔

"بیگم وقت آیا تو وہ بھی مل جائے گی، گھبراؤ نہیں"۔ اس نے بڑی متانت سے جواب دیا: "دراصل موجودہ سماجی زندگی میں ہر شخص کو سلیقے سے رہنا چاہیئے۔ اگر اپنے آپ کو اونچی سوسائیٹوں میں ذرا ٹپ ٹاپ سے نہیں پیش کیا جائے تو دنیا والے کوئی قدر نہیں کرتے"۔

بیچاری بیوی اس کا جواب سن کر لاجواب ہوگئی لیکن اس وضاحت سے اس کی تشفی نہیں ہوئی، وہ مزید ایک الجھن میں مبتلا ہوگئی۔ اب شوکت کا روزانہ بن ٹھن کر دفتر جانا معمول سا بن گیا تھا۔ دفتر میں اپنی پوزیشن منوانے کی خاطر ہر وضع سے جتن کرنے لگا تھا۔ خصوصاً کائنات کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس سے لیٹر ٹائپ کرانے کے علاوہ پرانی فائیلیں بھی چیک کرانے لگا تھا۔

ایک دن اس نے ٹائپ طلب خطوط کے ساتھ ایک پرزہ پر یہ لکھ کر بھیج دیا کہ "کائنات تم نے اب تک اپنی بحالی کی خوشی میں مٹھائی نہیں کھلائی"۔ کائنات شوکت کا لکھا ہوا پرزہ دیکھکر یک بیک چونک پڑی۔ اس کے محراب دماغ میں مختلف وسوسے انگڑائیاں لینے لگے۔ وہ عجیب تذبذب میں پڑگئی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے جواب لکھ کر بھیجدیا۔

"آپ شوق سے غریب خانے پر تشریف لائیں، میں آپ کی آمد کا خیر مقدم کروں گی۔"

کائنات کا مسرت آمیز جواب پاکر شوکت کی باچھیں کھل گئیں اور دل میں تمناؤں کے غبارے پھوٹ پڑے۔

سانولی سلونی شام تھی، موسم خوشگوار تھا، شوکت کائنات کے یہاں جانے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلا۔ پہلے وہ سیدھا ناصر کے یہاں گیا۔ اور اسے بھی ساتھ لے لیا۔ کائنات کے فلیٹ پر پہونچ کر ناصر نے کال بیل بجائی۔ کائنات جو چھوٹے کمرے میں کپڑے آئرن کر رہی تھی بیل کی آواز سن کر دوڑی آئی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اسکی نظر شوکت پر پڑی۔ جو سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے فوراً ماں سے کہا "شوکت صاحب آئے ہیں جاؤ اندر بلالو" اس کی ماں جو باورچی خانے میں کام کر رہی تھی، جلدی سے گئی اور دروازہ کھولکر انہیں اندر بلا لیا اور بڑے احترام سے انہیں صوفے پر بٹھایا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی شوکت کمرے کی دلکش سجاوٹ دیکھکر محو حیرت ہو گیا۔ وہ محویت کے عالم میں کھویا ہوا تھا کہ کائنات مسکراتی ہوئی آئی اور اخلاقاً سلام کر کے ماں کے عقب میں کھڑی ہو گئی۔ شوکت بول اٹھا۔

" ادھر میں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا تو سوچا کیوں نہ تم سے بھی ملتا چلوں"

"ذرہ نوازی کا شکریہ، آپ نے غریب کو یاد فرمایا" کائنات نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

" ماشاءاللہ اس چھوٹے سے کمرے میں اتنا سارا سامان جس قرینہ سے رکھا گیا ہے۔ واقعی قابل تعریف ہے۔"

وہ جھینپ سی گئی اور جھٹ دو انگریزی رسالے لاکر اس کے سامنے گول میز پر رکھ دیئے اور بولی۔" انہیں دیکھئے میں ابھی آتی ہوں"۔ وہ چلی گئی" پھر اس کی ماں بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک خوبصورت ٹرے میں کچھ مٹھائیاں بسکٹ اور دال موٹ سجا کر لائی اور میز پر رکھ کر کہا۔" نوش کیجئے۔"

"اتنا تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی کائنات، ایسا لگتا ہے شاید تم نے پہلے ہی سے پروگرام بنا رکھا تھا، میں تو صرف تم سے ملاقات کرنے آیا تھا"

"اس وقت آپ میرے مہمان ہیں، مہمان کا احترام اور تواضع کرنا میزبان کا فرض ہے۔ آپ میری خدمات کو قبول کیجئے، میں شکر گزار ہوں گی۔"

آج شوکت اتنے قریب سے کائنات کے طلسماتی سراپا کو دیکھ کر اپنے آپ میں نہ تھا۔ وہ بڑے خلوص سے بولا۔ "آؤ تم بھی بیٹھو"

کائنات کا گورا چہرہ اکبارگی سرخ ہو کر دمک اٹھا۔ اس کی گھنیری پلکیں شدت حیا سے جھک گئیں، وہ لجا سی گئی۔ آخر شوکت کے اصرار پر وہ مجبور ہو کر سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور انتہائی سادہ دلی سے بولی۔

"شوکت صاحب میں اپنی گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ ویسے آپ کو مدعو کرنا میرا فرض تھا، میں اسکی معذرت چاہتی ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم، میں کوئی غیر تھوڑا ہی ہوں۔ اس معذرت یا ندامت کی کیا بات ہے۔ سچ پوچھو تو کائنات تم جیسی ملازمت پیشہ خواتین سماج اور ملک کے لئے ایک غیر معمولی فرض ادا کرتی ہیں۔ ملک و قوم کو تم جیسی خواتین پر فخر و ناز ہے۔"

"شرمندہ نہ کریں میں آپ کی ممنون ہوں، شوکت صاحب میرے ساتھ بہت سارے مسائل ہیں، نوکری نہ کروں تو گھر نہیں چل سکتا، ماں ساتھ ہے، چھوٹی بہن سکندر آباد میں پڑھتی ہے۔ ایسے بہت سارے فرائض مجھ میں ہیں، خیر دکھوں کو دہرانے سے کیا حاصل" اس نے ناشتہ کی ٹرے کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کھائیے آپ خاموش بیٹھ گئے۔"

شوکت نے بڑے تکلف سے بسکٹ اپنے دانتوں میں دباتے ہوئے کہا "تم بھی ساتھ دو۔"

"میں بعد میں کھالوں گی۔ یہ آپ لوگوں کے لئے ہے۔"

شوکت اور ناصر دونوں کھانے لگے تو وہ فوراً چائے لانے اندر چلی گئی۔ ناشتہ سے

فارغ ہونے کے بعد شوکت سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "کائنات جس دن سے تم آفس میں آئی ہو، میرے دل میں لاشعوری طور پر عجیب احساس پروان چڑھ رہا ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے اب خود بخود اپنائیت میں بدلتا جا رہا ہے۔"

کائنات کی طشتری سی آنکھیں اچانک حیرت و استعجاب سے پھیل گئیں۔ اس کے سرخ لب کپکپا کر جھک گئے۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا نازک دل ناقوس کی طرح بج رہا تھا۔ وہ بمشکل تمام بولی "شوکت صاحب، میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں، یقین جانئے میرے شفیق ماموں جان ہو بہو آپ ہی جیسے تھے، وہی رنگ، وہی ناک نقشہ اور وہی انداز، سب کچھ ویسا ہی تھا، افسوس ۳ سال پہلے وہ جہاز کے ایک حادثہ میں فوت ہو گئے۔"

شوکت کے تلوّن خیز جذبات پر اکبارگی اوس پڑ گئی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے پُرتار میک آپ پر کیچڑ اچھال دی ہو۔

مینار گر پڑا

ریحانہ بڑے باپ کی بیٹی تھی، باپ کی دولت نے اس کے مزاج میں نخوت اور غرور کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اسے عام عورتوں کیطرح مرد کے ہاتھ کا میل اور پاؤں کی جوتی بنا پسند نہیں تھا۔ وہ مرد کا دل بنکر زندہ رہنا چاہتی تھی۔ ایسا دل جو ہر وقت چاند کی طرح گھٹتا اور بڑھتاہے اور جو اس کی ہر خواہش کو پورا کر سکتا ہو۔ وہ ایسے مرد کی عورت بننا چاہتی تھی جس کے پاس بینک بیلنس ہو، عالیشان مکان ہو، جس میں ایر کنڈیشنڈ کمرے ہوں، فریج ہو، ٹی وی ہو، قیمتی فرنیچر اور ضروریات زندگی کی تمام چیزیں ہوں۔

پرویز کالج میں اس کا کلاس فیلو تھا، ریحانہ کی رئیسانہ شان و شوکت اور نمائشی کروفر کو دیکھ دیکھ کر دل میں پیچ و تاب کھایا کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ ضد دن بدن گرہ بنتی جا رہی تھی کہ ریحانہ کو اپنے پاؤں کے نیچے کی چیونٹی کیطرح کچل دے مگر یہ کوئی انتقامی جذبہ نہیں تھا۔

وہ ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کی سگھڑ ماں نے اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے کی شادی کیلئے آہستہ آہستہ زیورات قیمتی کپڑے اور ضروری لوازمات اکٹھا کر لئے تھے۔ پرویز ابھی بی ایس سی کے آخری سال میں تھا کہ اچانک اس کی شفیق ماں نمونیہ کے شدید حملے میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بدنصیب پرویز کا مقدر پھوٹ گیا۔ گھر جو سوتیلی ماں آئی تو گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔ سوتیلی ماں اسے طرح طرح سے بدنام کرنے لگی تھی۔ باپ کی نظریں بھی

بدل گئیں۔ آخر اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بے سروسامانی میں اس کا کالج چھوٹ گیا۔ اسکی کسمپرسی دیکھ کر اس کی خالہ جان نے اپنے پاس بلا لیا۔ پرویز بہت ذہین اور سمجھدار لڑکا تھا۔ چند ہی دلوں کی تگ ودو کے بعد اسے شہر کے مشہور ڈاکٹر چودھری کا کے نرسنگ ہوم میں ملازمت مل گئی۔ کچھ دن بعد پھر اس نے خالہ جان کی ہدایت پر نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا مگر اس افراتفری میں اس کا ایک سال ضائع ہو گیا اور ادھر ریحانہ اسی سے ایک سال آگے ہو گئی۔

پرویز نرسنگ ہوم کے کام کے ساتھ ساتھ پڑھائی میں بھی برابر دلچسپی لیتا رہا۔ اس طرح چار سال بیت گئے۔ ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی سرپرستی میں اس کی میڈیکل پریکٹس اچھی خاصی ہو گئی۔ اب وہ خود بھی معمولی مریضوں کا معائنہ کرنے لگا تھا۔

ریحانہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھی کہ اسی دوران اس کے باپ پر دوبارہ فالج گر پڑا۔ اس بار حملہ اس قدر شدید تھا کہ ان کا سیدھا ہاتھ اور سیدھا پاؤں دونوں مفلوج ہو گئے۔ وہ صاحب فراش ہو گئے اور ریحانہ کی تعلیم تعطل کا شکار ہو گئی۔

—•—

ریحانہ کو نرسنگ ہوم میں غیر متوقع دیکھ کر پرویز حیران و ششدر رہ گیا۔ جب وہ ڈاکٹر چودھری کے روم میں آیا تو دیکھا ڈاکٹر چودھری ریحانہ کے باپ کا بڑی سنجیدگی سے معائنہ کر رہے تھے اور ان کے پائنتی دو معزز اشخاص رنج و غم کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں ایک نکتہ پر مرکوز تھیں۔ بڑھاپے میں فالج کا شدید حملہ بڑا تشویشناک تھا اس لئے ڈاکٹر چودھری نے معائنہ کے بعد احتیاطاً مریض کو نرسنگ ہوم میں داخل کر لیا۔

دوسرے دن ریحانہ اپنے باپ کو دیکھنے کار میں اکیلی آئی۔ کار سے اتر کر وہ دالان سے گذرتے ہوئے باپ کے بیڈ کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر پرویز پر پڑ گئی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے جسم میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔

وہ اپنی بے باک نظروں کو نیچے کئے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر اندرونی کشمکش کے تاثرات نمایاں تھے۔ بیٹی کو دیکھتے ہی باپ کے مرجھائے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی ہلکی لکیریں پھیل گئیں۔ ریحانہ باپ کی پیشانی پر محبت سے اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"طبیعت اب کیسی ہے ابو ــــ؟"

"دل کی دھڑکن تو کچھ کم ہے بیٹا لیکن یہ ہاتھ پاؤں بالکل شل ہو گئے ہیں"۔ انہوں نے نحیف اور لوٹے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا ہے ــــ؟" ریحانہ کے آزردہ چہرے پر فکر و تردد کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔

"اب تک چار انجکشن لگ چکے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ داہنا حصہ تو بالکل بے حس و حرکت ہے۔ کیا کہوں طبیعت رہ رہ کر گھبراتی ہے ــــ" ان کی کمزور اور شکستہ آواز لڑکھڑا کر حلق میں ڈوب گئی۔

باپ کی تشویشناک حالت دیکھ کر ریحانہ کی کرب ناک آنکھوں میں تیزابی آنسو جھلملا اٹھے۔ وہ ان کے سینے پر ہلکا ہلکا ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ وزیٹنگ آورس (Visiting hours) اب ختم ہونے والا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے لیکن ریحانہ باپ کے بیڈ کے پاس مجسمۂ غم بنی بیٹھی تھی۔ بالکل خاموش، لٹی ہوئی، جب تمام لوگ جا چکے تو پرویز ریحانہ کے قریب آکر نہایت اخلاق سے بولا "معاف کیجئے گا، ویزیٹنگ آورس ختم ہو چکا ہے۔ آپ بھی چلی جائیں"۔

ایک اجنبی آواز سنکر وہ یکلخت چونک پڑی جیسے اس کے سر پر کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو، اس کا بدن کانپ سا گیا مگر دوسرے ہی لمحہ پرویز پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں خفت اور شرمندگی سے بوجھل ہو گئیں اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی وہ پرویز ہے۔ اپنا ہم جماعت

پرویز! آخر بمشکل تمام اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ایکس کیوزمی (Excuse me) جی ہاں، جارہی ہوں۔" ایک بار پھر اس نے باپ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ابّو میں جارہی ہوں کل آؤں گی" وہ آہستہ آہستہ قدموں سے باہر جانے لگی، پرویز بھی نہ جانے کس خیال میں اس کے پیچھے صدر دروازے تک چلا آیا۔ وہ یکایک دروازے پر رک گئی۔ پرویز اس کی دلجوئی کرتے ہوئے بولا۔ "آپکے باپ پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے۔ ضعیف آدمی ہیں۔ خیر آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں"

ریحانہ کی رحم طلب آنکھوں میں یک بارگی آنسو چھلک پڑے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لئے میرے ابو کی جان بچا لیجیے، میں آپ کی عمر بھر احسان مند رہوں گی۔ دیکھئے اگر کچھ ہو گیا تو میں بے موت مر جاؤں گی۔"

پرویز نے اسکی اشک بار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت اعتماد سے کہا۔ "ریحانہ، اللہ پر بھروسہ رکھئے، حیات اور موت اسی کے اختیار میں ہیں۔ یقین جانئے آپکے باپ کے علاج معالجہ میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ وہ کسی پھلدار شاخ کیطرح جھک کر نہایت انکساری سے بولی "اچھا میں جارہی ہوں، کل آؤں گی۔ خدا حافظ"

"اچھا خدا حافظ" پرویز دروازے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بھیگی پلکیں پونچھتے ہوئے اپنی کار میں جا بیٹھی اور کار فراٹے بھرتی ہوئی چلی گئی۔

—•—

ڈاکٹر چودھری کی ہدایت کے مطابق ریحانہ کے باپ کو اسپیشل کیبن میں رکھا گیا تھا اور ان کے علاج پر خاص توجہ دی جارہی تھی۔ دو مہینے کے بعد وہ صحت یاب ہو کر گھر چلے گئے۔ مگر کسی سہارے کے بغیر وہ تنہا نہیں چل سکتے تھے۔ پرویز اپنی چھٹی کے دن انہیں ضرور دیکھنے آتا اور اسی بہانے ریحانہ سے ملاقات بھی ہو جاتی وہ کبھی کبھی بہت دیر تک بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہتے اور ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں

کو محسوس کرتے، یہ روح پرور ملاقاتیں ہمدردیوں میں تبدیل ہونے لگیں اور بے لوث ہمدردیاں دونوں دلوں میں اپنا گہرا اثر چھوڑتی رہیں۔ نتیجتاً دونوں کے دلوں میں ایک غیر مرئی درد کا احساس ہونے لگا اور وہ اپنی تمناؤں کے چراغ روشن کرنے کی پیشکش کرتے۔

ریحانہ کہتی "پرویز تمہاری بے لوث توجہات نے میرے ابو کی جان بچالی تمہاری ہمدردیاں، تمہارا احسان میری رگ رگ میں مچل رہا ہے۔ میں اس کی تلافی نہیں کرسکتی۔ سچ کہتی ہوں میرا سر بارِ احسان سے تمہارے سامنے جھکا رہے گا۔"

"یہ کیا کہتی ہو ریحانہ، پاگل تو نہیں ہوگئی ہو تم؟" پرویز قدرے ندامت سے بولا۔ "شفا دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ ڈاکٹر محض ایک بہانہ ہے، خدا کو منظور تھا تمہارے ابو صحتیاب ہوگئے، مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

ریحانہ کسی عمیق سوچ میں کھوگئی تھی۔ چنداں توقف کے بعد بولی "اگر بارِ خاطر نہ ہو تو ایک بات عرض کروں مگر تمہاری پرخلوص توجہ کی ضرورت ہے۔"

"کیا بات ہے ــــ ؟"

"بات یہ ہے" وہ چند لمحوں کے لئے رک گئی پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی "کیوں نہ ہم دونوں ملکر اپنی ایک کلینک کھولیں۔ ویسے تمہاری میڈیکل پریکٹس اچھی خاصی ہے۔ میں بھی میڈیکل کی طالبہ ہوں، تمہاری ہر قدم پر مدد کرسکتی ہوں۔ اس کلینک میں ہم مریضوں کے علاج کے لئے ہر طرح کا انتظام کریں گے۔"

"خیال تو بہت اچھا ہے۔"

"ایک دن میں نے یہ تجویز ابو کے سامنے بھی رکھی تھی، وہ بھی اس سے متفق ہیں، مزید برآں اس منصوبہ پر مالی امداد بھی دینے کو تیار ہیں۔"

"اللہ تمہارے ارادوں میں کامیابی عطا کرے۔"

"اللہ یقیناً ہمیں کامیابی عطا کرے گا پرویز۔" ریحانہ ایک عجیب نسوانی ادا سے بولی "اچھا اب بتاؤ کیا پیوگے؟ ٹھنڈا یا گرم ـ ؟"

"جو تمہاری پسند ہو" پرویز کے لہجہ میں سنجیدگی تھی۔

شربت روح افزا کے دو گلاسوں کے ساتھ ایک پلیٹ میں نمکین کاجو آگئے۔ ریحانہ نے کاجو کی پلیٹ پرویز کیطرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو، کاجو کھاؤ، بڑے ذائقہ دار ہوتے ہیں یہ"

"ناشتہ کے دوران ریحانہ نے شدت جذبات سے بیتاب ہوکر کہا

"پرویز، تمہارے تعاون سے میں اپنے ارادوں میں ضرور کامیاب ہوں گی۔ مجھے تم جیسے ہمدرد اور حوصلہ مند ساتھی کی تمنا تھی۔"

"اچھا تو پھر اپنی کلینک کا کام شروع ہو جائے۔ میری خدمات ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔"

"شکریہ میں کل ہی ابو سے کہکر آرڈر بھجوانے کا انتظام کرتی ہوں"

ان خوابناک لمحات اور روح پرور گفتگو میں دونوں اسقدر کھو گئے تھے کہ وقت کا پتہ نہیں چلا۔ گیارہ بجنے کی آواز سنکر پرویز یکلخت چونک اٹھا۔

"اچھا اب مجھے اجازت دو پھر ملوں گا، خدا حافظ"

"خدا حافظ" ریحانہ کی آواز میں رقت تھی۔

پرویز نے جھٹ اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور چل پڑا۔ ریحانہ کی محبت پاش نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

—•—

ریحانہ نے نہایت جاں فشانی سے بہت کم عرصہ میں کلینک کے قیام کا انتظام کر لیا۔ اس کی پسند کے مطابق شہر کے خوشگوار اور پرسکون علاقہ میں قائم کئے جانے والے کلینک میں تمام معمولی اور غیر معمولی دواؤں کے علاوہ مریضوں کی تشخیص کا بھی خاص انتظام تھا۔ یہاں زیادہ تر ولایتی دوائیں دستیاب تھیں۔ ریحانہ کے باپ کی خواہش کے مطابق پرویز کو کلینک کے ڈاکٹر کی ذمہ داریاں سونپی گئیں اور ریحانہ کو خواتین کا محکمہ دیا گیا۔ یعنی کلینک میں ڈاکٹر کے علاوہ لیڈی ڈاکٹر کا بھی تقرر ہو گیا۔ مزید برآں کلینک

کا نظم و نسق بھی نہایت عمدہ اور نفیس تھا۔

شہر میں ویسے اور بھی بڑے بڑے شاندار دواخانے تھے لیکن اس کلینک کی عمدہ اور تشفی بخش کارگزاری کی وجہ سے یہاں ہمیشہ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔

رفتہ رفتہ پرویز کے حسنِ سلوک اور رواداری نے ریحانہ کو اسقدر متاثر کیا کہ اس کی سخت گیر فطرت کی کایا پلٹ گئی۔ اسکی انا کا بلند مینار گر کر پاش پاش ہوگیا آخر اسے اقبال کرنا پڑا کہ پرویز ایک عظیم انسان ہے، سرچشمۂ محبت ہے اور اس کی زندگی ہے۔

سانولی سلونی شام تھی، سرمئی دھندلکوں نے شام کی سرخی میں ڈوب کر فضا میں ایک عجیب دلگداز رنگ بھر دیا تھا۔ باہر کے برآمدے میں دلربا آرام کرسی پر اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کئے ہوئے نیم دراز تھی اور اس کے عنابی لب انتہائی محویت میں گھڑی کے پرزوں کی طرح متحرک تھے۔ عقبی باغیچہ کی ہلکی ہلکی خوشبو دار ہوا فضا کو معطر کر رہی تھی دلربا نے ایک انگڑائی لیکر آنکھیں میچ لیں۔ اس کی کٹورے جیسی گول گول چمکدار آنکھیں پہلے کی طرح اب تھکا نہیں کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی۔

میں دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو کر دلربا کی اس محویت کو دیکھ رہی تھی معاً اسے بجانے کیا احساس ہوا کہ ایکا ایکی اپنے آپ وہ بڑبڑانے لگی۔ پھر دو ایک منٹ بعد خاموش ہو گئی۔ اب پہلے کی طرح وہ سنجیدگی دلربا میں نہیں تھی۔ اس کے طور طریق یکسر بدل گئے تھے۔ اپنی سہیلیوں سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ گم سم رہتی۔ اسکی اس وحشت کو دیکھ کر میں نے کئی بار چڑ کر چٹکیاں بھی لیں، لیکن وہ بے پروائی سے خاموش ہو گئی۔

دفعتاً چنچل ہوا کا ایک جھونکا لپکا اور اس کے دوپٹہ کا آنچل سینے پر سے گرا دیا۔ وہ پھر اکبارگی بڑبڑانے لگی۔ میں نے آخر بے ضبط ہو کر دروازے کی آڑ سے نکل کر آواز دی۔

"دلربا آپا ۔۔۔ ؟"

اس نے سوئی ہوئی ہرنی کی طرح چونک کر جواب دیا۔ "کون ہے، شہنائی؟"

"جی ہاں ۔۔۔ یہ کیا بڑبڑا رہی ہو۔ کیا کوئی افسانے کا پلاٹ تیار کر رہی ہو ۔۔۔ ؟"

"کچھ نہیں ۔" وہ جھینپ سی گئی۔ "شاید نیند کی جھپک میں کچھ کہہ گئی ہوں گی۔"

"اتنی جلدی تم کو نیند آ گئی ۔۔۔ ؟"

"بس یونہی ٹھنڈی ہوا میں ذرا میری آنکھ جھپک گئی تھی۔"

"شاید آج تمہارا جی نہیں لگ رہا ہے۔ چلو پھر ذرا بخمی بھائی کے یہاں سے ہو آئیں۔ بیچارے دو ایک دن میں کالج واپس چلے جائیں گے" میں نے دلربا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

وہ یکلخت چڑ گئی اور ناک بھوں چڑھا کر کہنے لگی۔ "شہنائی! میں نے تم سے ہزار مرتبہ کہا کہ مجھے فضول دق نہ کرو۔ خدا جانے تمہیں بخمی کا کلمہ پڑھنے میں کیا لطف آتا ہے۔"

"اچھا بھئی مجھے معاف کرنا۔ آئندہ میں کمبخت بخمی کا نام کبھی نہ لونگی۔"

دلربا یک لخت بے تاب ہو کر مجھے اپنے سینہ سے چمٹا کر انتہائی ہمدردانہ لہجہ میں کہنے لگی۔ "میری سہیلی، میں تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتی، تم میری ہمدرد ہو، ہمراز ہو اور سب کچھ ہو۔ چلو میں ابھی تمہارے ساتھ تمہارے بخمی بھائی کے یہاں چلتی ہوں۔"

"بخمی" شہنائی کا ماموں زاد بھائی تھا۔ بڑا دلچسپ آدمی تھا۔ ہمیشہ اپنے مزاحیہ انداز سے سب کو ہنسایا کرتا لیکن نہ جانے کیوں دلربا کو پریشان کرنے میں اسے کیا لطف آتا تھا۔

بہرطور ہم دونوں بخمی بھائی کے یہاں پہونچے۔ دلربا کو دیکھتے ہی وہ بے تحاشہ قہقہے لگا کر کہنے لگا۔ "آہا۔ آؤ آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"آپ کیوں انتظار کرنے لگے؟" میں طنز بھرے لہجہ میں بولی۔

"کیوں کیا ہوا ؟"

"دلربا آپا آپ سے خفا ہیں ۔"

"کیوں خیریت تو ہے ؟"

"پوچھ لیجیے ان ہی سے ۔ غریب نے بقر عید کے دن آپ کا انتظار کرتے کرتے آخر کلیجہ پر پتھر رکھ لیا ۔ اور آپ ایسے پتھر دل ٹھہرے کہ اس دن چہرہ بھی نہیں دکھایا ۔"

"اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں" نجمی بھائی بڑی ہمدردی سے بولے ۔ اس دن دوست احباب کا ایسا تانتا بندھا رہا کہ مجھے پانچ منٹ بھی باہر کسی سے ملنے کی مہلت نہیں ملی ۔ تمام دن مہمانوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہا ۔ بخدا مجھے مطلق یاد نہیں آیا ورنہ دلربا کے یہاں میں نہیں جاتا ؟ خیر میں سزاوار ہوں ۔ مجھے للہ معاف کردو ۔"

دلربا تڑق کر بولی : "باتیں نہ بنائیے آپ ، مردوں کی چکنے دار باتوں کو میں خوب جانتی ہوں ۔ آپ کو پریشان کرنا منظور تھا پریشان کیا ۔"

"دلربا سچ کہتا ہوں ۔ مجھ سے واقعی بھول ہو گئی ۔ میں خطا کار ہوں ۔ مجھے جو چاہو سزا دے لو ۔"

دلربا آپا کی حمایت کرتے ہوئے میں نے کہا ۔" دلربا آپا آپ کے لئے کتنی آرزوؤں اور مسرتوں سے پکوان پکائے تھے لیکن آپ کے نہ آنے سے سب اکارت ہو گئے ۔ اس بات کا مجھے بھی بہت صدمہ ہے ۔"

" دلربا ! اگر صرف میرے لئے تمہیں اتنا نقصان برداشت کرنا پڑا تو کہو میں تمہارے لئے سب کچھ قربان کر سکتا ہوں ۔"

"بس رہنے دیجئے ۔ قربانی دینے والوں کو دیکھ لیا ۔ مردوں کو چراغ بجھانا آتا ہے جلانا نہیں آتا ۔"

"تم یقین نہیں کرتی ہو دلربا ۔ میں واقعی مجبور تھا ۔ میری بات مانو ۔"

نجمی بھائی کی بے لبسی دیکھ کر مجھے کہنا پڑا " خیر معاف کردو دلربا آپا اگر کوئی

اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہو تو اسے معاف کر دینا چاہئے۔"

"شہنائی تمہاری اس ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔"

بجمی کی باچھیں کھل گیں اور فوراً رمضانی کو آواز دی۔ رمضانی دوڑا آیا۔

"ارے بھائی دیکھو، تمہارے یہاں مہمان آئے ہیں۔ ان کے لئے کچھ ناشتہ واشتہ لاؤ۔"

رمضانی فوراً دوڑ گیا۔ دلربا سامنے پڑی ہوئی میز پر سے "آزاد ہند" کا عیدالاضحی نمبر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ میں بھی بڑے اشتیاق سے دیکھنے کے لئے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اب بجمی بھائی کو کسیقدر تسلی ہوئی تو دلربا سے بولے "دلربا! اگر بار خاطر نہ ہو تو آؤ دو ایک بازی تعلیمی تاش کی کھیل لیں، طبیعت بہل جائے گی اور تب تک ہمارا ناشتہ بھی آجائے گا۔"

اس پر میں مچل کر بولی "ہاں، ہاں ضرور، بجمی بھائی کہاں ہے وہ تعلیمی تاش؟"

دلربا قدرے مسکرا کر میری طرف گھور کر دیکھنے لگی۔ بجمی بھائی پھر بولے۔

"شہنائی، دیکھو، اس الماری کی سیدھی دراز میں اوپر کیطرف تاش کا پیکٹ رکھا ہوا ہے نکال لاؤ۔"

میں تاش کی گڈی نکال لائی۔ بجمی بھائی تاش کے پتے سجانے لگے اتنے میں رمضانی ٹرے میں ناشتہ سجا کر لایا۔ وہ ویسے ہی تاش کو رکھ کر بولے۔

"آؤ دلربا پہلے ہم ناشتہ کرلیں پھر تاش کھیلیں گے۔"

رمضانی میز پر ناشتہ چن کر چلا گیا۔ ہم تینوں ناشتہ کرنے لگے۔ دلربا بڑا تکلف برتتے ہوئے کھا رہی تھی یہ دیکھ کر بجمی بھائی بولے۔

"دلربا! تم کھاتی کیوں نہیں ہو، آپس میں تکلف کیا۔ لو یہ سموسے ہیں، یہ کباب ہیں، یہ بسکٹ ہیں۔ کھاؤ، بے تکلف کھاؤ۔"

بہر طور ناز و نیاز کے ہچکولوں کے ساتھ ناشتہ ختم ہوا تو بجمی بھائی نے تاش کا پیکٹ کھولا اور پتے سجانے لگے اور ہم تینوں میں بازی شروع ہو گئی۔ دلربا بڑے

احتیاط سے کھیل رہی تھی۔ عمدہ عمدہ الفاظ اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن کوئی پندرہ منٹ کے اندر نجمی بھائی نے فتح کا اعلان کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں چوبیس نمبر سے ہار گئی اور دلربا چالیس نمبر سے شکست کھا گئی۔

نجمی بھائی دلجوئی کے انداز میں کہنے لگے۔ "ارے بھائی پہلی مرتبہ ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ دیکھنا ابکی بار دلربا ضرور جیت جائے گی۔"

بہرکیف دوسری بازی شروع ہوئی اس مرتبہ دلربا نے پتے تقسیم کئے اور اتفاق سے دلربا کے حصے میں بہت عمدہ پتے چلے گئے۔ اس بار سب کے سب بڑی ہوشیاری سے الفاظ مرتب کر رہے تھے۔ کوئی نصف گھنٹے بعد دلربا نے فتح کا اعلان کر دیا۔ نجمی بھائی آٹھ نمبر سے اور میں پندرہ نمبر سے مات کھا گئی۔ دلربا شدتِ مسرت سے تالیاں بجانے لگیں۔ اور جھٹ اٹھ کر پچھلے صوفے پر بیٹھ گئی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کبھی نجمی بھائی کی صورت دیکھتی اور کبھی دلربا کی۔ دونوں نے نظروں نظروں میں کیا کہا کہ نجمی بھائی بھی چپ چاپ اٹھ کر کرسی پر ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر کے نیم دراز ہو گئے اور دلربا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ ان کی نظروں میں محبت، مصلحت اور مجبوریاں ایک ساتھ انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ وہ سگریٹ کے کش لگائے جا رہے تھے اور اسی عالم میں اس قدر کھوگئے کہ جلتی ہوئی سگریٹ سے انکی انگلی جل گئی۔ وہ تڑپ اٹھے اور دلربا بے تاب ہو گئی۔ جیسے اسکو کسی نے چرکا لگا دیا۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ جھینپ سی گئی اور جھٹ اٹھکر بائیں باغ کی طرف چلی گئی۔ اور فوارے کے قریب بنچ پر بیٹھ گئی۔ سفید دودھ جیسی چاندنی میں اس کے گورے جسم پر دھوپ چھاؤں کا لباس اسقدر خوبصورت معلوم ہو رہا تھا گویا کسی بہترین مجسمہ ساز نے اپنے شاہکار مجسمہ کو مسکراتی چاندنی میں لا کر رکھدیا ہو۔ میں نے پیچھے سے جا کر کہا

"کس چت چور کی یاد چٹکیاں لے رہی ہیں۔"

"تم بڑی منہ پھٹ ہو شہنائی" دلربا خفا سی ہو گئی۔

"لیکن یہ نجمی بھائی بھی بڑے بے درد آدمی ہیں۔ کسی کو تڑپتے دیکھ کر

بہت خوش ہوتے ہیں۔"

"دنیا میں سب سے خطرناک مرض محبت ہے شہنائی۔"

"کیا تم نجمی بھائی سے . . . . محبت کرتی ہو؟" میں نے اسکی چٹکی لی۔

"وہ خاموش ہوگئی اور اپنی چمکدار آنکھیں جھکالیں۔

"نہیں شہنائی یہ بات نہیں ہے۔" وہ جھجکتی ہوئی آواز میں بولی۔

لیکن اس کے لب کانپ رہے تھے اور وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

نجمی بھائی تو کسی صورت دلربا سے شادی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک بڑی مجبوری ہے۔ پھر بھی وہ مرد ہیں۔ وہ اپنا خیال تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر میں جھپٹ کر نجمی بھائی کے کمرے کی جانب جانے لگی۔ مگر دلربا نے مجھے روک دیا اور کہنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو شہنائی؟"

"نجمی بھائی کا دماغ صحیح کرنے کے لیے۔"

"یہ بے سود ہے۔ سرد شعلے دکھائی نہیں پڑتے۔ وہ اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں۔"

"نہیں میں آج ان سے سمجھ کر ہی رہوں گی۔"

"ٹھہرو میری بھولی شہنائی، تم نہیں جانتیں کہ چاہنے میں جو لطف ہے وہ چاہے جانے میں نہیں۔"

دلربا کی اس بے بسی پر میرا دل بھر آیا۔ میں نے دیکھا انتہائی رنج و غم کے زیر اثر اسکی لمبی لمبی گھنی پلکوں پر نقرئی آنسو چمکنے لگے۔ میں نے اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن میرا گلا بھر آیا اور اس سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

صبح کا بھولا

جمیلہ بیگم پڑوسن کی بات سن کر حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ اس نے ہوٹل نٹراج میں
فیروز کو نشہ میں دھت ایک آوارہ انگلو انڈین لڑکی کو اپنی باہنوں میں بھر کر ناچتے دیکھا تھا۔
کسی سنجیدہ لڑکی کے ساتھ ڈانس کر لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ وہ انگلو انڈین لڑکی
بازاری قسم کی لگتی تھی۔ وہ دونوں ہی نشہ میں بیہودہ اور شرم ناک حرکتیں کر رہے تھے۔
یہاں تک کہ ہوٹل کے مینیجر کو انہیں ہوٹل سے باہر کرنا پڑا تھا۔ گالیاں بکتے اور مینیجر کو دھمکیاں
دیتے ہوئے فیروز لڑکھڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

پڑوسن تو پوری طرح لگا بجھا کر چلی گئی تھی لیکن جمیلہ فکر و تردد کے گہرے غار
میں گر گئیں۔ غلطی کس کی ہو سکتی ہے؟ ان لوگوں نے تو اپنے بچوں کیلئے زندگی کی ساری
سہولتیں مہیّا کی تھیں۔ اچھے، معیاری کونونٹ اور پبلک اسکول میں انہیں پڑھایا تھا۔
بچوں کی خدمت کے لئے ہمہ وقت نوکر چاکر گھر میں موجود تھے۔ اچھے سے اچھا کھانا اور قیمتی
کپڑے ان کے لئے لائے جاتے، پھر ایسا کیوں ہوا؟ کچھ ایسی ہی اڑتی اڑتی باتیں
انہوں نے اپنی پاکیزہ کے بارے میں بھی سنی تھیں لیکن ان باتوں پر انہوں نے زیادہ دھیان
اس لئے نہیں دیا تھا کہ شاید اپنے شوہر سے حسد رکھنے والے لوگوں کی پست ذہنیت کی
اختراع ہو۔ انہوں نے پاکیزہ کو ہمیشہ اپنے سیمینار، ٹیوٹوریل کے لئے کالج اور یونیورسٹی
کے پروگراموں میں جاتے یا پھر اپنی کتابوں میں مگن دیکھا تھا۔ اس کے لئے غلط راہ پر چلنے

کے لئے کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ویسے دونوں بچے انگریزوں کیطرح بے ساختہ انگلش بول لیتے تھے۔ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے۔ ان کے یہ اونچے طور طریقے دوسرے بچوں کے والدین کے لئے جلن کا سبب ہو سکتے تھے۔ جمیلہ بیگم اور ان کے شوہر ریاض حسن کو اپنے خوش اخلاق اور ہونہار بچوں پر بہت فخر تھا۔ فیروز انجینئرنگ کالج میں پڑھتا تھا۔ پڑھائی میں دونوں بچے بہت ذہین تھے لیکن اب یہ کس قسم کی پراگندہ باتیں سننے کو مل رہی تھیں؟

شام کو دفتر سے آتے ہی ریاض حسن صوفے پر لیٹ سے گئے۔ جمیلہ بیگم نے سوچا شاید گرمی کی وجہ سے ایسا ہے وہ جھٹ شربت روح افزا بنا کر لائیں۔ ریاض حسن نے شربت پی کر گلاس تپائی پر رکھ دیا اور آنکھوں پر بایاں ہاتھ رکھ کر پھر نیم دراز ہو گئے۔ جمیلہ بیگم نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا کہ کہیں بخار تو نہیں؟ ریاض حسن نے لمبی سانس لیکر ان کا ہاتھ دھیرے سے ہٹا دیا اور کہا "بخار وخار کچھ نہیں، یونہی سر درد ہے۔"

"وکس ویپورب مل دیتی ہوں، آپ لیٹ جائیے۔"

"وکس سے کچھ نہیں ہوگا۔" ریاض حسن سیدھے ہو کر بیٹھ گئے "بچے اب پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں جمیلہ، جانتی ہو، آج سابجی گول چکر کی چاٹ کی دکانوں کے سامنے کچھ آوارہ سے چھوکرے ایک چاٹ والے کو مفت چاٹ نہ کھلانے پر اندھا دھند پیٹ رہے تھے۔ اس کی دکان کا ستیاناس کر دیا اور ساری کمائی بھی چھین لی۔"

"کسی نے روکا نہیں انہیں؟"

"بھلا عام لوگ اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالیں۔ جب تک پولس آئی وہ سب پھینک پھانک کر فرار ہو گئے، میں بھی اپنا اسکوٹر گھما کر دوسرے راستہ سے آیا۔"

"یہ سب تو یہاں روزمرہ کا دھندا بن گیا ہے۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟"

"یہ معمولی بات نہیں ہے جمیلہ" ریاض حسن نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان لڑکوں میں لال پیلے چارخانی جیک کی شرٹ اور سفید پینٹ پہنے ایک لڑکا بھی تھا۔ یہی کپڑے تم پچھلے ہفتے فیروز کے لئے کمائی سنٹر سے خرید کر لائی تھیں نا، یاد ہے؟"

جمیلہ بیگم کانپ گئیں، ان کے ذہن میں کوندا سا لپکا، ان کی پڑوسن نے جھوٹ

نہیں کہا تھا۔ فیروز آوارہ اور عیاش لڑکوں کی صحبت میں پڑ گیا ہے۔ وہ صحیح بات تھی۔ اچانک انہیں اپنے پرس اور الماری سے غائب ہوتے روپیوں کا بھی خیال آیا۔ جن کے لئے وہ نوکروں کو دھمکا چکی تھیں۔ وہ ناحق غریب لوگوں پر الزام لگا رہی تھیں۔ ظاہر ہے فیروز اپنے آوارہ ساتھیوں پر اڑانے کے لئے ان کے پرس پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ انہوں نے دھیمی آواز میں ریاض حسن کو دن میں اپنی پڑوسن سے سنے ہوئے حادثے کے بارے میں بھی بتا دیا۔

تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ جمیلہ نے فون اٹھایا۔

"پاکیزہ ہے؟" ادھر سے آواز آئی۔

کچھ سوچ کر جمیلہ بیگم نے کہا "ہاں پاکیزہ ہی بول رہی ہوں"

"ڈارلنگ کل شام جوبلی پارک کے بڑے گیٹ کے سامنے ضرور ملو۔ میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

لیکن ماں۔۔۔۔" جمیلہ بیگم نے زیادہ نہیں کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسری طرف سے بولنے والا لڑکا ان کی آواز پہچان جائے۔ وہ معاملہ کی تہہ تک پہونچنا چاہتی تھیں۔

"ارے ماں کو مارو گولی، کسی سہیلی کے یہاں جانے کا بہانہ بنا کر نکل جانا۔ پہلے بھی تو ایسا کئی بار کر چکی ہو۔"

"اچھا ــــ" جمیلہ بیگم بھرے لہجہ میں بولیں۔

"ٹھیک پانچ بجے، بڑے گیٹ کے بائیں طرف" فون بند ہو گیا۔

ریاض حسن بھی سارا قصہ سن رہے تھے۔ کچھ دیر تک دونوں میاں بیوی کسی عجیب سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر جمیلہ بیگم نے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔ ایسے چپ چاپ رہنے سے کیسے کام چلے گا۔"

"اب کیا کرنے کو رہ گیا ہے جمیلہ، دونوں بچے ہاتھ سے نکل چکے ہیں، میں تو اپنے دفتر کے کام سے اکثر دور رہتا ہوں، لگتا ہے تم گھر کا خیال ہی نہیں رکھتیں، تمہیں تو جنتا سیوا سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ دن رات نیشنل لیڈرز کانفرنس، فیملی ویلفیئر سنٹر اور کیا کیا چکروں میں گھر سے غائب رہتی ہو۔"

"ہاں اب سارا قصور میرا ہی بتائیں گے۔ آپ کبھی تو سنیچر کی رات تاش کی چوکڑی میں پاگلوں کیطرح اتوار کی صبح تک کھوئے رہتے ہیں اور مجھے کبھی جائے سپلائی کرنے میں پھنسائے رکھتے ہیں۔ جوان بیٹے کے سامنے گھر میں کھلے عام شراب کی بوتل کھولکر بیٹھ جاتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ گانوں کی محفلوں میں بیٹھ کر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ کیا یہی سب گھر سدھار کے لچھن ہیں؟"

ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کی بارش تھمی تو دونوں نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا تب دونوں کے خیال میں آیا کہ انہیں اپنے بچوں کے دوستوں، کالج کے اوقات اور پاکیزہ کے بارے میں کسی بھی بات کا پتہ نہیں تھا۔ شروع شروع میں دو ایک بار پاکیزہ اور فیروز نے اپنے دوستوں کو سالگرہ کے موقع پر مدعو کیا تھا تو جمیلہ بیگم نے بے موقع سمجھ کر ٹال دیا تھا۔ پھر دونوں بچوں کو روپے دیکر کہدیا تھا کہ کسی ریستوران میں ہی پارٹی کا انتظام کر دو۔ دوبارہ جب پاکیزہ نے ٹی پارٹی کے لئے اپنی سہیلیوں کو بلایا تو جمیلہ بیگم نوکروں کو گھر کے ضروری کام بتا کر ویلفیر سنٹر چلی گئیں۔ جہاں تہذیب و ترقی کے نئے دور پر ایک لیڈر کی تقریر تھی۔

اب ٹھوکر کھانے پر دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ جمیلہ بیگم اٹھ کر پاکیزہ کے کمرے میں گئیں۔ وہاں کا نقشہ دیکھ کر وہ حیران ہو گئیں۔

پڑھنے کی موٹی موٹی کتابوں پر دھول جمی ہوئی تھی۔ جیسے انہیں کسی نے ہاتھ لگایا ہی نہ ہو۔ میز کی دراز میں فلمی ایکٹریسوں کی اخلاق سوز تصویریں اور بہت سے محبت بھرے خطوط بھرے پڑے تھے جن میں عہد و پیماں کی قسمیں کبھی کھائی گئی تھیں۔ ماں باپ کی طرف سے شادی کرنے کی اجازت نہ دیئے جانے پر کورٹ میرج کرنے کا بھی بار بار ذکر کیا گیا تھا۔

رات کو جمیلہ بیگم نے اپنے شوہر کو صلاح دی کہ وہ لڑکے کو جاکر دیکھ آئیں۔ شاید وہ پاکیزہ کے لائق ہو۔ ریاض حسن بیوی کی بات مان گئے۔ ویسے دونوں کو یقین تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں۔

دوسرے دن ریاض حسن چہل قدمی کرتے ہوئے جوبلی پارک کی طرف چلے گئے۔ جوبلی پارک کے بڑے گیٹ کے بائیں طرف ایک ہپی سنا لڑکا سگریٹ پیتا ہوا کھڑا تھا۔ اسے

دیکھ کر وہ قدرے ٹھٹک گئے اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے لگے عجیب حلیہ تھا اس لڑکے کا۔ سر کے روکھے بال گردن سے نیچے لٹک رہے تھے۔ جسم پر گلابی پھولدار شرٹ اور آسمانی جینز کی چست پینٹ۔ اسے دیکھکر وہ چپ چاپ واپس چلے آئے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کہ کہاں وہ پاکیزہ کے لئے کسی معزز گھرانے کے نیک اور خوش اخلاق لڑکے کی تلاش میں تھے اور کہاں یہ ہپی بندر کا بچہ۔

وہ کمرے میں تنہا بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کی سطح دماغ پر مختلف خیالات پانی میں مچھلیوں کیطرح لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

"اب پاکیزہ کو ڈرانے دھمکانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر زیادہ سختی کی گئی تو وہ غلط قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔"

اتنے میں جمیلہ بیگم چائے لیکر آگئیں۔ وہ بیوی کو سمجھانے لگے۔ "دیکھو اب گھر کا ستون ہل گیا ہے۔ ممکن ہے اب بھی سنجیدگی سے توجہ دی جائے تو بگڑی بات بن سکتی ہے۔ اور غلط قدم صحیح راستہ پر آسکتا ہے۔"

اب گھر کا طور طریق بدل گیا تھا۔ جمیلہ بیگم اب اپنی پاکیزہ کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ میں زیادہ وقت لگائے رکھتی تھیں۔ کبھی کبھی پاکیزہ ماں کی باتیں سنتے سنتے بور بھی ہو جاتی تھی لیکن جمیلہ بیگم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے پاکیزہ کو بازار چلنے کے لئے کہا کہ سامان خریدنے میں انکی مدد کرے۔ پاکیزہ نے سوچا چلو' باہر جانے کا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ ماں کو بازار میں چھوڑ کر پکچر چلی جاؤں گی لیکن جمیلہ بیگم نے اس سے ساڑیاں پسند کرنے کو کہا۔

"بیٹی میری پسند تو اب پرانی ہو چکی ہے۔ تم ہی ذرا نئے فیشن کی نئے پرنٹ والی ساڑیاں پسند کردو۔"

بازار گھوم گھوم کر بڑی بڑی دکانوں سے جمیلہ بیگم نے پاکیزہ کو اچھے اچھے جوڑی دار کرتے پاجامے اور پرکشش قمیض شلوار کے سیٹ بھی خرید وادیئے۔ پہلے تو پاکیزہ ناک بھنویں چڑھاتی رہی پھر ماں کا دل رکھنے کے لئے راضی ہوگئی۔ گھر آکر اس نے نئی

ریشمی ساڑیاں پہن کر دیکھا۔ نرم اور جھلملاتے ریشمی کپڑے اسے بڑے اچھے لگے۔ پھر ماں کے ساتھ ایک پارٹی میں بھی گئی۔

ادھر ریاض حسن نے بھی فیروز کیطرف زیادہ توجہ دینا شروع کردی تھی۔ وہ اس سے اسکی پڑھائی اور کالج کے معاملہ میں تنبیہ کرتے، ان کی نصیحتوں کو سر جھکا کر سن لیا کرتا۔

ایک دن ریاض حسن اس کے کمرے میں اسٹیریو سننے کے لئے چلے گئے۔ ساتھ میں فریج سے بیئر کی بوتل بھی نکال لی تھی۔ پہلے بیئر کا گلاس فیروز کیطرف بڑھا دیا۔ فیروز سٹ پٹا گیا۔ بے ساختہ بولا۔ "نہیں اباجان میں شراب نہیں پیتا"

"اچھا ___!" ریاض نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آج کل تو لڑکے میٹرک پاس کرتے ہی بگڑ جاتے ہیں۔ اپنے ماں باپ کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ اور شراب بھی پیتے ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ میرا سمجھدار لڑکا ان سب خرافات سے محفوظ ہے"

ریاض حسن نے ساری بیئر نالی میں بہادی۔ ادھر فیروز نے باپ کی نظر بچا کر فوراً سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس جو کھڑکی کے پردے کے پیچھے رکھی ہوئی تھی آہستہ سے اٹھا کر کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دی۔ ریاض حسن کچھ فلمی گیت سنکر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور الماری سے ایک کیسٹ نکال لائے اور فیروز سے کہا۔

"یہ داہیات فلمی گانے کیا سنتے رہتے ہو، لو یہ کیسٹ مہدی حسن کے گائے ہوئے حقانی گیت اور نعتیہ کلام ہے جس کے سنتے ہی دل و دماغ میں توحید کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔"

فیروز نے ایک سعادت مند لڑکے کی مانند فوراً کیسٹ بدل دیا۔ مہدی حسن کی روح پرور آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

اب ریاض حسن اسے راہ راست پر لانے کے لئے نت نئے اور دلچسپ انداز میں روزانہ سمجھانے کی کوشش کرتے، کبھی کبھی ملک کے بحران پر گفتگو کرتے، کبھی ورلڈ کپ فٹبال کے بارے میں کہتے تو کبھی کرکٹ ٹسٹ کے متعلق تذکرہ کرتے۔ کبھی ملک میں مہلک سیلاب سے جانی نقصانات اور کروڑوں کی املاک کی بربادی کا تذکرہ کرتے

اب آہستہ آہستہ فیروز کا فضول گھومنا اور آوارہ لڑکوں سے ملنا ملانا بہت کم ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات رات کو کھانے کی میز پر بھی ریاض حسن مذہبی باتوں کی روشنی میں قرآن و حدیث کی نصیحت آمیز باتیں اور حسن واخلاق کی اہمیت پر تفصیل سے شگفتہ اور دلچسپ انداز میں گفتگو کرتے۔ اس کا اثر سب پر بہت اچھا پڑتا تھا۔ اگر کسی بات پر کچھ اختلاف کبھی پایا جاتا تو ریاض حسن دونوں بچوں کو بڑی ہمدردی اور اپنائیت سے سمجھاتے اور کہتے کہ ماں باپ اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کی ہر امکانی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی برائی ہر گز نہیں چاہتے۔ اب میرا ہی معاملہ لو، پچھلے دو سال سے کمپنی کا بڑا افسر ہونے کے ناتے مجھ پر بہت ساری ذمہ داریاں عائد کر دی گئی ہیں اس لئے تم لوگوں پر زیادہ توجہ نہیں دے سکا۔ علاوہ ازیں کمپنی کے کام کے سلسلہ میں مجھے شہر سے اکثر باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ جانتے ہو! یہ سب کس کے لیے کرتا ہوں۔ صرف تم لوگوں کے روشن مستقبل کے لیے، تمہاری امی کو بھی میری بیوی ہونے کے ناتے کئی سماجی کاموں میں شریک ہونا پڑتا ہے، تم دونوں ہماری اولاد ہو، ہمیں تم دونوں پر مکمل بھروسہ ہے، یقین ہے کہ اچھی تعلیم و تربیت تمہیں کبھی گمراہ نہ ہونے دے گی۔

ریاض حسن کی بصیرت افروز گفتگو سے جمیلہ بیگم کا غم و غصہ جاتا رہا اور پاکیزہ اور فیروز نے اپنے جھکے ہوئے سر اٹھاتے ہوئے نہایت انکساری سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ابا جان، ہم کبھی آپ کا سر نیچا نہیں ہونے دینگے۔"

"میرا سر کیا نیچا ہو گا، تم دونوں کا سر میں خود اونچا کرنے کا اہتمام کرنے جا رہا ہوں۔" پھر جمیلہ بیگم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "قاضی الانوار امام کے بیٹے کو گزشتہ عید کے موقع پر تم نے دیکھا ہی تھا۔ ان کے گھر سے پاکیزہ کا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا ٹاٹا کمپنی میں انجینئر ہے۔ معزز خاندان ہے، وطن میں بھی خاصی جائیداد ہے۔ ایک ہی لڑکا ہے ان کا۔ لڑکا بھی روشن خیال اور خوش

اخلاق ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، انہیں کیا جواب دوں۔"

ادھر پاکیزہ کا حسین چہرہ بارِ حیا سے گلنار ہو رہا تھا۔ وہ جھٹ اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں بھاگ گئی اور ادھر جمیلہ بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ کے ان گنت تارے جگمگا اٹھے۔

پھر انہوں نے فیروز کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹے تمہارے لئے بھی بات پکی کر لی ہے۔ دیکھو تمہاری دو مہینوں کی چھٹیاں ہیں، میرا ایک ٹھیکیدار دوست ہے جو خاص طور سے سرکاری عمارتیں بناتا ہے اسے ایک ایماندار و ذہین آدمی کی ضرورت ہے۔ اس کے پاس دو مہینے کام کر لو، تمہیں کام کا تجربہ ہو جائے گا اور سرکاری افسروں سے اچھے تعلقات بھی ہو جائیں گے۔ اور اوورسیئر (Overseer) کی سند بھی حاصل ہو جائے گی۔ اب میں پاکیزہ کی شادی کا ساز و سامان اکٹھا کر رہا ہوں۔"

"اباجان آپ کا حکم سر آنکھوں پر" فیروز کے لہجہ میں حوصلہ نمایاں تھا۔

"میں بھی انشاءاللہ پاکیزہ کو اس کی شادی کے موقع پر قیمتی نذرانے اور تحفے دینے کی کوشش کروں گا۔"

"بہت خوب اللہ تمہارے ارادوں میں کامیابی عطا کرے گا۔ لیکن پہلے تم تجربہ کار ہو جاؤ پھر اس گھر کو خود سنبھالو گے۔ سچ پوچھو تو اب مجھ میں زیادہ دوڑ دھوپ کرنے کی طاقت نہیں رہی۔ اب مجھے ریٹائر ہونے کے بعد آرام کرنا چاہئے مگر اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم بھائی بہنوں کی شادیوں کا فرض ادا کر دوں۔"

دونوں ماں بیٹے یک بارگی مسکرا اٹھے اور ریاض حسن کے بلند قہقہے کمرے میں گونج اٹھے۔

دکھ سکھ

ریاض احمد نہایت خوش اخلاق اور دیانتدار آدمی تھے اور اپنے اصول کے پابند لیکن قدرت کی عجیب مصلحت تھی کہ بیچارے بہت کم عرصہ میں سات بچوں کے باپ بن گئے۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں ۔ سب سے بڑا جبار تھا ۔ جب جبار کی عمر ۱۲ سال کی تھی تو اسکی امی جان کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ کے بعد ریاض احمد ایکدم بادلے سے ہو گئے۔ بچوں کی پریشانیوں سے گھبرا کر انہوں نے سب بچوں کو انکی بڑی اماں کے گھر پہونچا دیا اور خود بھی وہیں رہنے لگے۔ چھ مہینہ کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان کی ذہنی کشمکش اور الجھنوں میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ مصیبتوں کا ایک ریلا گھر میں چلا آیا اور گھر کی حالت ناقابل برداشت ہو گئی۔

گھر کی چند جہاندیدہ خواتین کیطرف سے اب ان پر دوسری شادی کرنے کا آہستہ آہستہ دباؤ پڑنے لگا لیکن وہ انکار کرتے رہے کیونکہ وہ خود اپنی زندگی میں سوتیلی ماں کا مزہ چکھ چکے تھے ، علاوہ بریں ان کے دل میں کوئی تمنا، کوئی احساس باقی نہیں تھا۔ انہیں اپنی آسائشوں سے زیادہ ان سات معصوم بچوں کا مستقبل سنوارنے کی فکر لاحق تھی ۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے انہوں نے وطن سے اپنی بیوہ چچازاد بہن کو بلالیا۔ پھوپھی کو پاکر پریشان حال بچوں کے مرجھائے ہوئے چہروں پر مسرت اور تازگی کے آثار عود کر آئے اور آہستہ آہستہ اس اجڑے چمن میں بادِ بہار کے فرحت بخش جھونکے چلنے لگے۔ بچوں کی دیکھ بھال میں پھوپھی نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی بلکہ انہیں ممتا بھرا پیار مہیا کرنے کی امکانی کوشش کرتیں، بچے بھی انہیں اپنی ماں کی مانند عزت و

احترام کرنے لگے تھے۔

اسطرح دن پر لگاکر گزرتے رہے۔ جبار اب نہایت ہوشیار اور چست ذہن لڑکا ہوگیا تھا وہ ایک انجینئرنگ کمپنی میں کام بھی کرنے لگا تھا۔ عزیزو اقارب۔ نے رائے دی کہ کم از کم جبار کی شادی کر دیجیے گھر کی الجھنیں دور ہوجائیں گی۔ یہ سنکر وہ ایک عجیب الجھن میں پڑ گئے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے جبار کی شادی کا فیصلہ کیا اور بہت جلد ایک شریف اور پڑھی لکھی لڑکی کو بیاہ کر لائے۔ چند روز میں نئی دلہن افسری نے گھر کی پریشانیوں کو بھانپ لیا اور گھر گرہستی کے کاموں میں پھوپھی کا ہاتھ بٹانے لگی۔ پھوپھی افسری کے کاموں سے کافی مطمئن تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں بعد انہوں نے افسری کو گھر کی ساری ذمہ داریاں سونپ دیں کیونکہ انہیں یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا۔ اب وہ وطن جانے کیلئے بے چین ہو رہی تھیں۔ ریاض احمد نے بھی مصلحتاً کوئی مزاحمت نہیں کی۔

وطن جانے سے کچھ دن بیشتر پھوپھی نے سب بچوں کو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ سب بچے آکر انہیں چمٹ گئے۔ وہ سب کو سینے سے لگا کر فورِ جذبات سے رو پڑیں۔ انہیں روتے دیکھ کر بچے بھی بے ضبط ہو کر رونے لگے۔ کچھ دیر بعد آنسوؤں کا طوفان تھما تو انہوں نے بچوں کو شفقت و محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا "میرے بچو، میں اب تک تمہاری خدمت کرتی رہی اور ممتا بھرا پیار دیا مگر اب تمہاری بھابی ویسی ہی تمہاری دیکھ بھال کریں گی، تم بھی ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ اور شکوے گلے نہ کرو۔"

پھر بڑے اعتماد سے وہ افسری سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"بیٹا! میں تمہیں پہلے ہی ساری باتیں سمجھا چکی ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا وہی عورت اپنی زندگی میں کامیاب ہوتی ہے جو میکے کی بات سسرال میں اور سسرال کی بات میکے میں کبھی نہ کہے۔" پھر یک بیک ان کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے اور افسری بھی بے ضبط ہو کر ان کی گود میں سر ڈال کر سسکیاں بھرنے لگی۔

٭ • ٭

جبار کا گھر بسانے کے باوجود ریاض احمد کو سکون و راحت میسر نہیں ہوئی، ان کے پھوٹے نصیب کو سکون کہاں ملتا۔ اب بڑی لڑکی پروین کے رشتے بھی آنے لگے تھے۔ لیکن انہیں کوئی بھی رشتہ پسند نہیں آتا۔ ایک دن ان کے پڑوس کی بڑی بی جو پروین کو بہت چاہتی تھیں اپنے بھتیجے احمد کا پیغام لیکر آئیں۔ بڑی بی کی ساری باتیں ریاض احمد نے بڑے غور سے سنیں پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "خیر مجھے آپکی باتوں پر بھروسہ ہے لیکن مجھے دو ماہ کا وقت دیا جائے۔"

بڑی بی بہت امیدیں لے کر خوشی خوشی چلی گئیں۔ دوسرے دن ریاض احمد نے بچوں کی بڑی اماں اور خالہ جان کو بلوا کر بڑی بی کا پیغام سنایا۔ پھر ضروری تحقیقات کے بعد رشتہ منظور کر لیا گیا۔ شادی کا دن بھی آ گیا۔ پروین دلہن بنکر منڈپ میں سسک سسک کر روئے جا رہی تھی، سرخ زرتار گھونگھٹ کے اندر پلکیں لرز رہی تھیں، گلابی رخساروں پر آنسو چمک رہے تھے۔ اتنے میں خالہ جان اچانک گھر کے اندر آ گئیں، اسے روتا دیکھ کر ان کے آنسو بھی چھلک پڑے۔ وہ پروین کو گلے سے لگا کر گلوگیر آواز میں کہنے لگیں "بیٹا مت رو ہر لڑکی جوان ہو کر پرائی ہو جاتی ہے۔ اور پھر شادی کے بعد اپنے شوہر کی ہو جاتی ہے۔ اچھی اور نیک لڑکیاں وہی ہیں جو سسرال جا کر میکے کا نام روشن کرتی ہیں۔"

پروین اپنی سسرال چلی گئی تو ریاض احمد کو بیٹی کے بچھڑنے کا سنگین جھٹکا لگا۔ وہ صدمہ کی تاب نہ لا کر بستر پر گر گئے اور ایسے گرے کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے نوکری سے استعفیٰ دیدیا اور اپنے منجھلے لڑکے نجمی کو اپنی سروس میں بھرتی کرا دیا۔

نوکری چھوڑنے کے بعد وہ بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح شاید فکر اور پریشانیوں کا دباؤ ان کے بڑھاپے پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ دن بدن ان کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے اپنی زندگی میں جلد سے جلد اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو جائیں۔ لاشعوری طور پر ان کے سطح دماغ پر مختلف خیالات ابھرنے لگے۔ نجمی برسر روزگار ہو چکا ہے اور بیٹی منی بھی جوانی کی دہلیز پار کر چکی ہے۔ کیوں نہ دونوں کی شادیاں کرکے بے فکر ہو جائیں لہٰذا ان رشتوں کی تلاش شروع ہو گئی۔ چند دن کے اندر اچھی طرح چھان پھٹک کر تمام رشتے طے کر لئے اور نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ دونوں کی شادیاں کر دیں۔ گھر میں ویرانی

بھولتے بھی چند دن کے اندر طرح طرح کے شکوے شکایتیں شروع ہو گئیں۔ ریاض احمد مگر سنجیدہ اور دانشمند آدمی تھے۔ مسئلہ کو زیادہ طویل ہونے نہیں دیا اور اپنے چھوٹے سے کنبے کو بگڑنے سے بچا لیا۔ مگر بدنصیب نادان بھی غیروں کے اکسانے پر اپنا سارا سامان لیکر کرائے کے مکان میں چلا گیا۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد ان کا تیسرا لڑکا شمیم عرب جانے کے چکر میں بمبئی گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔ وہ بہت ذہین اور اچھا ریفریجریٹر میکانک تھا۔ اس لئے بمبئی میں اسے ایک امریکن فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ کوئی چھ مہینے بعد اس نے دس ہزار روپے کسی ایجنٹ کو دینے کے لئے منگائے۔ ریاض احمد بغیر تحقیق کئے روپیہ بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن جبار کی سفارش پر انہوں نے روپے بھیج دیئے۔ آخر نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ کچھ دن بعد ایجنٹ روپے لیکر بھاگ گیا۔ یہ منحوس خبر پاتے ہی ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد وہ بستر پر ایسا گرے کہ گھر سے گورستان جانے تک اٹھ نہیں پائے۔

●

ریاض احمد گئے، تو جبار کے نحیف کندھوں پر ذمہ داریوں کا پہاڑ رکھ گئے۔ ابھی اسے گھر گرہستی کا تجربہ ہی کیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی مثنی بی اے کر کے گھر میں بے کار بیٹھا تھا۔ اس کی ملازمت کے لئے وہ جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ کل ہی شام کو بھرتی آفس کے بڑے بابو کے گھر جا کر اس سے بڑی منت سماجت کی اور اپنے گھر کی ساری پریشانیاں کھول کھول کر اس کے سامنے رکھ دیں لیکن بڑا بابو پتھر کا دیوتا تھا۔ ایمان فروش غریب کی فریاد کا اسے پتھر جیسے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ساری رام کہانی سننے کے بعد بھی اس نے کورا جواب دیدیا، بولا "ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ اگر تم ہزار روپے دے سکتے ہو تو تمہارے بھائی کے کام کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے۔"

یہ سنکر جبار ایکدم سناٹے میں آ گیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر اپنی مجبوریاں دہرائیں۔ بڑا بابو خاموش سنتا رہا، پھر کچھ ساعت کے بعد بولا "ہم

کیا کریں بھیا، بڑے صاحب کو خوش کرنا پڑتا ہے، بڑا صاحب نہیں مانتا، خیر تمہارے ساتھ اتنی مجبوریاں ہیں تو کم از کم پانچسو روپے دیدو۔ بڑے صاحب کو ہم کسی طرح سمجھا لیں گے۔ اچھا جاؤ" اگلے منگل کو آؤ، بھگوان چاہیں گے تو تمہارا کام ہو جائے گا۔"

آخر کار جبار مایوس ہو کر چلا آیا۔ برآمدے میں سائیکل رکھ کر آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ افسری بچوں کو سلا کر برآمدے میں آئی تو دیکھا کہ وہ گہری سوچ میں بیٹھا ہے، اس نے قریب آکر ایک عجیب دلگداز مسکراہٹ سے کہا "کھانا کھا لیجئے ـــــ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

ایک سرد آہ بھر کر اس نے بھیگی آواز میں کہا۔ "منا کی نوکری کے لئے بڑے بابو کے پاس گیا تھا، حرامخور پانچسو روپے رشوت مانگتا ہے، بتاؤ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی، کون قرض دے گا۔ سود پر کبھی اگر لیا جائے تو پانچسو کے ہزار ادا کرنے پڑیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔!"

"پانچ سو روپے مانگتا ہے؟" افسری ہکا بکا سی ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل ٹوٹ کر حلق میں آکر پھنس گیا ہو۔ اس کی حیرت زدہ نظریں جبار کے افسردہ چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور تمام ماحول پر عجیب پژمردگی چھا گئی۔ معاً اس کشمکش سے چونک اٹھی اور سنجیدہ لہجہ میں بولی۔

"اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ میری شادی کی دو انگوٹھیاں ہیں انہیں بندھک رکھ دیجئے۔ منا کا کام ہو جانے کے بعد چھڑالی جائیں گی۔"

افسری کے حوصلہ افزا الفاظ سنکر جبار کا شکست خوردہ دل یکبارگی اچھل پڑا، اور شدت جذبات سے بے ضبط ہو کر وہ گویا چیخ اٹھا

"پر تم کیا کہہ رہی ہو افسری، کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

"جی ہاں بلکل ـــــ !" افسری کی وفا شعار نگاہیں جھک گئیں

"واقعی تم انسان نہیں فرشتہ ہو افسری" اس کے چہرے پر یکلخت بے پناہ مسرتوں کی شفق پھوٹ پڑی اور شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اسنے

افسانے کے خوبصورت پیکر کو اپنی جذباتی باہوں میں کس لیا۔

• •

ڈیوٹی سے آنے کے بعد جبار برآمدے میں اپنی سائیکل صاف کر رہا تھا۔ یک بیک اس کا خیال اپنے بچوں کی طرف دوڑ گیا۔ اس کے دونوں بچے شبانہ اور قیصر انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے۔ آج ان کے اسکول میں ریزلٹ آؤٹ ہونے والا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بچوں کا رکشہ گیٹ پر پہونچا۔ رکشے سے اتر کر دونوں بچے فرطِ خوشی سے اچھلتے کودتے دوڑ کر باپ سے لپٹ گئے اور ایک ساتھ کہنے لگے۔ "ہم پاس ہو گئے ڈیڈی ابا، ہم پاس ہو گئے۔" جبار نے دونوں بچوں کو فرطِ محبت سے اپنی باہوں میں لے کر بے شمار بوسے لے لیے۔ پھر دونوں کھلکھلاتے ہوئے گھر کے اندر ماں کے پاس چلے گئے۔ جبار پھر سائیکل صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اس کے اعصاب دماغ میں مختلف خیالات مچلنے لگے "بچے اب پاس ہو گئے ان کے لیے اب نئی کتابیں اور کاپیاں خریدنی ہوں گی۔ نئے سال کے پہلے مہینہ میں اسکول کی فیس بھی دگنی ادا کرنی پڑے گی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں کھویا ہوا تھا کہ کمرے کے اندر سے افسری نے آواز دی "آپ بڑے بابو کے پاس کب جائیں گے؟"

جبار یکلخت چونک اٹھا اور جھٹ پٹ منھ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور آدھی پیالی چائے پی کر چل دیا۔

رات وہ دیر سے لوٹا، بڑے بابو نے باتوں باتوں میں بہت دیر کر دی۔ کچھ کافی پلانے کیلئے کچھ دیر اور روک لیا تھا۔ وہ سائیکل رکھ کر بغیر کپڑے اتارے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کا یوں پلنگ پر لیٹ جانا افسری کو کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے فوراً آ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے لیٹ کیوں گئے؟"

جبار تھکا ماندہ مسافر کی طرح کسمساتے ہوئے اٹھا اور سگریٹ کا لچھے دار دھواں نتھنوں سے چھوڑتے ہوئے ہلکے تبسم سے بولا۔

"کچھ نہیں بھان دنا، سب ٹھیک ہے، اگر بار خاطر نہ ہو تو تھوڑی سی چائے پلادو مجھے۔ بڑے بابو نے کالی کافی پلاکر منھ کا مزہ خراب کردیا۔"

"اچھا۔۔۔ آج کافی پلائی اس نے؟ افسری کی نرگسی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں اور ہونٹوں پر کیسلی مسکراہٹ کی کرنیں چمک اٹھیں۔

"ہاں بیٹا بہت خوش تھا آج" جبار دونوں شانے اچکا کر شوخ لہجہ میں کہا۔

افسری چائے بنانے چلی گئی اور وہ اپنی بوجھل آنکھیں بند کئے پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ معًا اس کے سطح دماغ پر اس کی چھوٹی بہن زرین کی شادی کا یادگار واقعہ رقص کرنے لگا۔

ابا جان کا غم تازہ ہی تھا کہ زرین کی شادی کا وقت قریب آگیا۔ میرے کمزور کندھوں پر پہاڑ جیسی ذمہ داریاں آگئیں۔ وہ ذاتی میری آزمائش کے دن تھے۔ بلکہ میرا فرض تھا۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے مجھے کمپنی سے قرض لینا پڑا۔ اپنا اسکوٹر بیچ دیا مگر پھر بھی پیسوں کی کمی ہوگئی تھی۔ اس آڑے وقت میں افسری نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر اس وقت وہ میری مدد نہیں کرتی تو دولہے کی تمام فرمائشیں پوری نہیں ہو پاتیں۔ پھر نہ جانے ہماری کتنی ذلت ہوتی۔ افسری نے مجھے دل برداشتہ دیکھ کر اپنے سونے کی دونوں چوڑیاں یہ کہکر دیدیں کہ انہیں بیچ کر دولہے کی فرمائشیں پوری کردیجئے۔ میرے تمام جسم میں اس وقت جھرجھری سی دوڑ گئی تھی۔ بیشک عورت ایثار اور قربانی کا پیکر ہے۔۔۔۔"

اتنے میں افسری چائے لیکر آگئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس کے ہاتھ سے چائے لیکر پینے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ چائے نہیں لافانی پیار و محبت کا دریا ہو۔

پیٹ کا سوال

کوئی گیارہ بارہ کا عالم تھا، جاڑوں کی رات کے وشال سناٹے میں کسی رکشے کے چرچرانے کی آواز سنائی پڑی۔ درگا جو شام سے ڈیوڑھی میں بیٹھی اپنے پتی کا انتظار کر رہی تھی آواز سنکر اس کے تیز کان ایسانک کھڑے ہو گئے۔ اور بنا پلک جھپکائے غور سے دیکھنے لگی۔ رکشا قریب آیا تو اس نے گہری تاریکی میں بھی اپنے پتی کو پہچان لیا۔ پدم داس نشے میں دھت رکشے میں اوندھے منھ پڑا تھا۔ پتی کو اس حالت میں دیکھ کر درگا یکلخت ابل پڑی اور سر پیٹ پیٹ کر چیخنے لگی پھر کسی غیرمرئی قوت سے اپنے حواس پر قابو پاکر اس نے پدم داس کو رکشے سے اتارا اور لسبورتے ہوئے گھر کے اندر لے گئی اور چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور سر دھول مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ درگا کی نظر اچانک اس کی پھٹی ہوئی جیب پر پڑی تو وہ فوراً جیب ٹٹولنے لگی۔ قمیض کی جیب شاید راستہ میں کہیں کھینچا تانی میں کٹ پھٹ گئی تھی۔ لیکن جب اس نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو تنخواہ کا لفافہ پھٹا ہوا پایا۔ لفافہ میں صرف ۵۵ روپے تیس پیسے تھے۔ لفافہ میں اتنی قلیل رقم دیکھکر وہ حواس باختہ ہو گئی اور ویسے ہی لفافہ موڑ کر اپنی کمر میں ٹھونس لیا پھر گھڑے کا ٹھنڈا پانی بالٹی میں بھر کر آنگن میں لائی۔ پدم داس کو اپنے دونوں بازوؤں کا سہارا دیکر چارپائی سے اٹھا لائی۔ اور چوکی پر بیٹھا کر اس کا سر اور ہاتھ پاؤں اچھی طرح دھوئے۔ گندے کپڑے بدلکر اسے پھر چارپائی پر لٹا دیا۔ اس وقفہ میں پدم داس کا ہوش قدرے عود کر آیا۔ درگا نے دو روٹیاں اور اچار لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ یوں تو وہ بھوکا تھا ہی انتہائی

بے صبری سے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ چارپائی پر نیم دراز ہو کر بیڑی پینے لگا۔ غیر متوقع طور پر اس کی نظر زمین پر ننگے بدن سوئے ہوئے دونوں بچوں پر پڑی۔ معصوم بچے آدھا پیٹ کھا کر سو چکے تھے۔ اس دوران درگا نے بچی روٹیوں کے نیچے کھچے ٹکڑوں کو زہر مار کر لیا پھر کام سے فارغ ہو کر وہ پدم داس کی چارپائی کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔ پدم داس بدستور بیڑی پئے جا رہا تھا۔ درگا نے نہایت رقت بھری آواز میں کہا۔

"سنتے ہو، تمہاری تنخواہ کا لفافہ جیب میں پھٹا ہوا تھا اور اس میں صرف پچیس روپے اور کچھ پیسے تھے۔ باقی رقم کیا ہوئی؟"

پدم داس کی خمار آلود آنکھوں میں یکبارگی چنگاریاں بھر گئیں وہ گرج کر بولا "میں نے تجھے ہزار بار کہا کہ میرے معاملہ میں تو کچھ نہ بول، لیکن تو نے کتے کی دم کی طرح پھر ٹیڑھا سوال کیا ہے، منہ بند کر ورنہ اسی دن کی طرح پھر مار کھائے گی۔"

درگا نے دل کڑا کر کے پھر اسی لہجہ میں کہا "ایسا لگتا ہے کہ تم نے غصہ ہونے کی قسم کھائی ہے۔ میں جب کبھی کوئی اچھی بات کہتی ہوں تو تم یکدم بگڑ اٹھتے ہو کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ تمہیں تو کسی بات کی پرواہ نہیں۔ گھر پر نحوست کے جو گھناؤنے بادل چھائے ہوئے ہیں تمہیں کب دکھائی دیں گے۔ گھر میں اناج نہیں۔ بچے آدھا پیٹ کھا کر سو جاتے ہیں، ان کے بدن پر صحیح سلامت کپڑا کبھی نہیں، بھک منگوں سا روپ بگاڑے گھومتے رہتے ہیں۔ اسکول جو جاتے تھے وہ کبھی بند ہو گیا۔ پاس پڑوس سے مانگ کر گھر چلاتی ہوں۔ میں عورت ذات کہاں تک سنبھالوں، اب تو تمہاری کمائی کی کوئی آس نہیں رہی۔ ساری تنخواہ دوستوں کے ساتھ ملکر دارو میں پھونک دیتے ہو۔ بتاؤ اب ان پچیس روپوں سے کس دیوتا پر کیول چڑھاؤں۔ میں محنت مزدوری کر کے کہاں تک گھر کا خرچ چلاتی رہوں۔ اپنا پیٹ جلا کر بچوں کا آدھا پیٹ کاٹ کر پہاڑ جیسی زندگی کے دن گزار رہی ہوں لیکن تمہیں ذرا اس کا احساس نہیں۔ اگر تم کسی عورت کو جھیل نہیں سکتے تھے تو شادی کیوں کی تھی۔ تنہا کنوارے بنے

بکھرتے رہتے۔"

پدم داس چندا ماما کی کہانی کی طرح درگا بیتا سنتے سنتے سو گیا۔ درگا نے اسے بے سدھ سوئے دیکھا تو خود بھی چپ چاپ بچوں کے پاس زمین پر لیٹ گئی۔

—•—

پدم داس سات دن سے سرکاری اسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا کر ایک قصبہ میں دیسی شراب پی لی تھی۔ اسی رات اسے اس کے قے اور دست آنے لگے اور دو ہی دن میں حالت غیر ہو گئی۔ اس کی تشویشناک حالت دیکھ کر پڑوسیوں نے ملکر اسے سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا تھا سات دن بیہوشی کے عالم میں گذر گئے۔ کوئی آثار نظر نہیں آرہا تھا۔ دراصل اس نے زہریلی شراب پی لی تھی اور شراب کا زہر اس کے تمام جسم میں سرایت کر گیا تھا اس لئے کوئی دوا موثر ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی جان توڑ کوششیں کیں مگر وہ نہیں بچ سکا۔ چودہ دن تک اسپتال کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر آخر دم توڑ دیا۔

پدم داس کے مرنے کے بعد درگا بتی کے سوگ میں کچھ دن مرجھائی مرجھائی سی رہی لیکن بہت سوچ سمجھ کر اس نے اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کو سنوارنے کیلئے اپنے ٹوٹے دل کو بلند حوصلوں کا سہارا دیا کیونکہ اب تک وہ دُمدر کے جھکولے کھاتے کھاتے تنگ آگئی تھی۔ کرب ناک ماحول میں گھٹ گھٹ کر سانسیں لے رہی تھی۔ اور فکر و تردد کی دلدل میں اس کا وجود ایک بے حس پتھر بن گیا تھا۔ لیکن اب شکست خوردہ ذہنیت کا تمام گرد و غبار اس کے طوفانی حوصلوں کی زد میں بہہ گیا آخر کار اسے سماج کے اندھے اصولوں اور خاندانی روایات کی کھوکھلی دیواروں کو ٹکرا کر اپنی ایک نئی روشنی بنانے کی خاطر میدانِ عمل میں آنا پڑا۔

درگا اپنے چھوٹے کنبہ کی اب تنہا ذمہ دار تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ گھر کی خستہ حالی نے اسکی اکیلی جان کے لئے بے شمار مسائل پیدا کر دیئے تھے۔

بلا شبہ درگا ایک سلیقہ مند اور سمجھدار عورت تھی۔ وہ گھر کے اخراجات سے نمٹنے کیلئے پتی کی زندگی میں کبھی اپلے بنا کر فروخت کرتی تھی اب اس نے پاس پڑوس سے پرانے اخبار لا کر ٹھونگے بنا کر دکانداروں کو سپلائی کرنا شروع کر دیا۔ بچے کبھی اسی کام میں بڑے چاؤ سے اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

ایک دن درگا پرانے اخبار لانے کے ارادے سے میجر سلطان سنگھ کے بنگلے پر گئی۔ میجر سلطان سنگھ ملیٹری ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ وہ جمشید پور میں چار سال سے اسٹیل فیکٹری میں ایک آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ درگا جب بنگلے کے لان میں داخل ہوئی تو دیکھا ان کی ماتا جی برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ درگا کو سامنے دیکھ کر ان کے سنجیدہ چہرے پر قدرے تاسف کے سائے بکھر گئے۔ درگا انہیں سلام کر کے نیچے بیٹھ گئی اور اسکی آنکھوں میں یکلخت آنسو امنڈ آئے۔ ماتا جی نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

"مت رو درگا، بھگوان تیری تکلیف دور کریں گے، بتا کیسے چلی آئی، بچے کیسے ہیں تیرے؟"

درگا اپنی ساڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ "ماتا جی — اپنی بپتا آپ سے کیا بتاؤں جانے والا تو ہمیں دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا اور مکتی ہو گیا لیکن اب ان معصوم بچوں کے لئے در در کے جھکولے کھانے پڑتے ہیں۔ دن بھر کام کرتے کرتے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ جاتا ہے۔ بھگوان کا شکر ہے اس کی مہربانی سے چار پیسے کما لیتی ہوں۔ ابھی کچھ دنوں سے بڑے لڑکے کو ایک سائیکل دکان میں کام سے لگا دیا ہے۔ وہ کبھی کچھ پیسے لے آتا ہے۔ اب تنگدستی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ کمپنی کے کوارٹر میں رہتی ہوں۔ گھر کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ چند دن پہلے پڑوسیوں نے مشورہ دیا تھا۔ میں نے انہی کی کوشش سے سلیمان وکیل کے ذریعہ پتی کی کمپنی کے مینیجر کے نام درخواست بھیجدی ہے۔ درخواست میں لکھا ہے کہ پتی کے مرنے کے بعد اب میرا اور میرے معصوم بچوں کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ اپنی بیوگی کی حالت میں کافی پریشان ہوں

میرا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ آپ نے سورگ باشی پدم داس کے بدلے مجھے کام دیا جائے سلیمان وکیل نے امید دلائی ہے کہ بھگوان نے چاہا تو میرا کام ضرور ہو جائے گا بس، میرے یتیم بچوں کے لئے آپ لوگ بھی دعا کیجئے۔ اگر میں کام سے لگ گئی تو تروپتی جاکر بھگوان کی پوجا کروں گی۔ آپ یقین جانئے ماتاجی سلیمان وکیل بڑے نیک اور رحمدل آدمی ہیں۔ بیچارے نے میرے لئے اب تک بہت سارے کام کر دیئے لیکن ایک پیسہ نہیں لیا اسی لئے میں نے بھی ان کے کہنے پر بال بچوں والے ایک مسلمان آدمی کو اپنا ایک کمرہ کرائے پر دیدیا۔ اس سے دو سو روپے ایڈوانس لیکر چھوٹے لڑکے لئے ایک پان کی دکان لگادی ہے۔ یہ لڑکا زیادہ ہوشیار نہیں ہے۔ اس لئے کبھی کبھی مجھے بھی دکان پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ مالک کی دیا سے دکان اچھی چلنے لگی ہے۔۔"

اتنے میں موٹر کی آواز سنائی دی۔ بڑی ماتاجی نے فوراً کہا "میجر صاحب آگئے"۔
میجر صاحب درگا کو دیکھتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ درگا ان کو دیکھ کر سٹ پٹاگئی اور گھبراہٹ کے عالم میں ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "کتنے بجے ماتاجی ــ؟"

"پانچ بج گئے"۔

"ہائے رام، میں آئی تھی کس کام کے لئے مگر باتوں ہی میں کافی وقت گزار دیا"۔
ماتاجی نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کس کام کے لئے آئی تھی؟"

"میں آپ سے پرانے اخبار لینے آئی تھی۔ جتنے بھی اخبار آپ کے پاس بیکار ہیں وزن کرکے دیدیجئے میں خرید لوں گی آپ جانتی ہیں، میں اپلے بنا کر بیچتی ہوں اور اب اخباری کاغذ سے ٹھونگے بھی بنا کر بیچنے لگی ہوں، کیا کروں، پیٹ کا سوال ہے، کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے"۔

ماتاجی نے نوکرانی کو آواز دی، نوکرانی آئی تو انہوں نے کہا

"بڑی میز کے نیچے پرانے اخبار ہیں، سب اٹھا لاؤ"۔

نوکرانی فوراً گئی اور ایک کونے میں ڈھیر سے اخبار اٹھا لائی۔ ماتاجی نے اخبار کا ٹوکرا درگا کیطرف ذرا کھسکاتے ہوئے کہا "اسے لے جاؤ اور

ٹوکرا خالی کر کے واپس کر دو اور پیسے جو منا سب ہو ٹوکرا لی کو دیدینا۔"

درگا حیرت و استعجاب سے ماتا جی کو تکنے لگی۔ اس کے پژمردہ ہونٹ کچھ کہنے کو کپکپائے لیکن بارِ احسان سے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر سنبھل کر اخبار کا ٹوکرا اٹھایا اور تشکر آمیز نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ چلی گئی۔

دھوپ چھاؤں

آدھی رات کو غیر متوقع دستک کی آواز سنکر جمنا دیوی چونک کر اُٹھ بیٹھی اور لائٹ جلا کر آواز دی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں دیپک، دیول پور سے آیا ہوں۔"

جمنا دیوی نے فوراً پتی کو جگایا۔ "دیکھئے کون آیا ہے؟"

"کون ہے؟" منوہر بابو بھی سوتے میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔

"پتہ نہیں، کہتا ہے دیپک ہوں"

انہوں نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں دیپک ہوں، دیولپور سے آرہا ہوں۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد منوہر بابو نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر قدرے حیرت سے بولے۔ "ارے تم دیپک، کیسے آئے؟"

دیپک نے ایک چٹھی جیب سے نکال کر منوہر بابو کو دیدی۔ چٹھی پڑھ کر ان کے چہرے پر ناخوشگوار شکنیں بکھر گئیں۔ چٹھی پڑھ کر جمنا دیوی کو دیدی اور دیپک سے کہا۔ "آؤ اندر آؤ، ادھر کنارے اپنا سوٹ کیس رکھدو، صبح بات کریں گے۔"

دیپک کے لئے وہیں سونے کا انتظام کر کے دونوں میاں بیوی اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بستر پر لیٹتے ہوئے جمنا دیوی نے منوہر بابو سے پوچھا۔ "کس کی چٹھی ہے، کیا لکھا ہے؟"

"تاؤجی کی چٹھی ہے۔ لکھا ہے، دیپک پڑوسی کا یتیم لڑکا ہے، تمہارے یہاں کالج میں نام لکھوانے جا رہا ہے۔ تم اسے صرف رہنے کا سہارا دیدو، باقی سارا خرچ وہ خود برداشت کرلیگا۔"

جمنا دیوی دل برداشتہ ہو کر بولی "ان مہمانوں کی ریل پیل سے کلیجہ منہ کو آگیا۔ کمبخت کوئی نہ کوئی آئے دن سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی اپنی گرہستی ڈس رہی ہے۔ پھر اس پر بن بلائے مہمانوں کا تانتا، جینا حرام کردیا ہے۔"

صبر کرو جمنا دیوی، تاؤجی کا حکم ہے۔ انکار نہیں کرسکتے، بھگوان ہماری مدد کرے گا، کسی غریب کی مدد کرنا بھی بھلائی کا کام ہے نا، بیچارہ پڑا رہے گا ایک کنارے"

دو سال پر لگا کر نکل گئے، کوئی پتہ بھی نہیں چلا، غریب دیپک اپنی پڑھائی لکھائی میں مگن رہتا، کالج سے چپ چاپ گھر آتا اور اپنی جگہ سونے چلا جاتا۔

دوسرے سال بھی اس نے اچھے نمبروں سے پاس کیا اور بی اے میں چلا گیا۔ دیپک چست ذہن لڑکا تھا۔ اسے سرکار سے وظیفہ بھی ملتا تھا اور اس نے محلہ میں دو ایک ٹیوشن بھی کرلئے تھے۔

منوہر بابو میونسپلٹی کے دفتر میں ٹائپسٹ تھے۔ ان کی لڑکی سنگیتا مشن اسکول میں دسویں اسٹنڈرڈ میں پڑھتی تھی۔ گھر کے اخراجات بڑی مشکل سے چلتے تھے۔ پڑوس میں وکیل صاحب رہتے تھے۔ ان سے منوہر بابو کی خوب چھنتی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً منوہر بابو کی مالی مدد بھی کردیتے تھے۔ ان کی اس ہمدردی اور حسن اخلاق پر منوہر بابو ان کے مقدموں کے کاغذات اپنے دفتر سے ٹائپ کرکے لا دیتے تھے۔

اس سال بارش بہت زوروں پر تھی، طوفانی ہواؤں میں منوہر بابو کے کھپریل کے مکان کی چھت کئی جگہ سے اجڑ گئی۔ بارش کا پانی مسلسل ٹپکنے لگا تھا۔ اب غریب دیپک کے لئے رات کا سونا ناممکن سا ہو گیا تھا۔ منوہر بابو نے وکیل صاحب سے بڑی انکساری سے کہا۔

"وکیل صاحب! میرے مکان کی چھت ہواؤں سے ٹوٹ گئی ہے، بارش کا

پانی بری طرح ٹپکنے لگا ہے، غریب دیپک کا سونا مشکل ہو گیا ہے اگر آپ کے یہاں کوئی گنجائش ہو جائے تو بڑا احسان ہوتا۔"

وکیل صاحب نے اقرار کر لیا دیپک اگلے دن سے وکیل صاحب کی کوٹھی میں سونے لگا تھا، کچھ دن بعد وکیل صاحب کے کہنے پر وہ منوہر بابو کے گھر سے اپنا سوٹ کیس بھی وہیں لے گیا۔ مگر سنگیتا کو پڑھانے کے لئے ان کے یہاں روز جاتا تھا۔

ایک دن باتوں باتوں میں منوہر بابو نے اپنی بیوی سے کہا "جمنا دیوی، اب اپنی سنگیتا جوان ہو گئی ہے، میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کی شادی کر دینا چاہئے کیونکہ آجکل بچے بہت جلد بگڑ جاتے ہیں۔"

جمنا دیوی نے کچھ سوچ کر کہا "مگر اپنی لڑکی انگریزی پڑھی لکھی ہے۔ اس کیلئے ویسا ہی پڑھا لکھا لڑکا چاہئے۔"

"اس کی نکر مت کرو لڑکا قریب ہی ہے" کچھ رک کر پھر بولے: "اپنا دیپک"

"دیپک۔ اگاؤں کا گنوار لڑکا میری سنگیتا سے بیاہ کرے گا؟"

"یہ کیا کہتی ہو تم، وہ تعلیم یافتہ، ہونہار اور عقلمند لڑکا ہے۔ اگلے سال ایم لے کر لے گا تو کالج میں پروفیسر ہو جائے گا۔ ہماری سنگیتا خوشحال رہے گی۔ پھر سسرال والوں کا کوئی جھمیلا بھی نہیں۔"

جمنا دیوی کچھ دیر سوچتی رہی پھر اپنے آپ مسکراتی چلی گئی۔ اب منوہر بابو دیپک کو سمجھانے کیلئے موقع کی تلاش میں تھے۔

—•—

سردی کے موسم میں منوہر بابو کو گٹھیا کا درد بہت پریشان کرتا تھا۔ ایک دن رات میں یک بیک موذی درد بہت تکلیف دینے لگا جمنا دیوی سے ان کی بےچینی دیکھی نہیں گئی۔ اس نے سنگیتا سے کہا "بیٹی جلدی جاؤ، دیپک کو بلا لاؤ۔ ڈاکٹر کو لے آئیگا۔"

سنگیتا شال اوڑھے ڈرتی، سہمتی باہر نکلی، اکیلی جانے میں وہ ہچکچا رہی تھی

لیکن جانا ازحد ضروری تھا۔ مرتی کیا نہ کرتی، بھگوان کا نام لیکر چل پڑی۔ وکیل صاحب کے گھر پہونچی تو دیکھا کہ دیپک کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہے۔ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ آہستہ سے چوروں کی طرح اس کے دروازے پر دستک دی۔ ہاتھ لگتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے مالی جو سو رہا تھا ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سنگیتا کو دیکھکر حیرت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹی! اتنی رات میں آئی ہو؟"

وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی تھی۔ مالی نے ہمدردی سے پھر پوچھا "دیپک... بابو کو بلانے آئی ہو؟"

وہ چپ سادھے مالی کو دیکھ رہی تھی، مالی نے مزید کہا

"دیپک بابو آج کل وکیل صاحب کے کمرے میں رہتے ہیں۔"

اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ وکیل صاحب دیپک پر اب اسقدر مہربان ہو گئے ہیں؟ مالی نے اس کے مایوس چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر بہت ضروری کام ہو تو انہیں بلا لاؤں۔"

"نہیں ——" وہ بمشکل تمام بول سکی۔

"اچھا تو چلو میں تمہیں گھر تک پہونچا دوں" مالی نے اپنی بوسیدہ چادر لپیٹ لی، پھر دونوں چل پڑے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد راستہ میں مالی نے کہا۔

"بیٹی اب ایسا لگتا ہے کہ دیپک بابو وکیل صاحب کے مکان ہی میں رہ جائینگے" چند لمحے رک کر پھر کہا "داماد بنکر"

سنگیتا کے سارے بدن میں یکلخت ایک سنسناہٹ دوڑ گئی تھی اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل سینے کی دیوار توڑ کر زمین پر گر پڑے گا..

اسی ادھیڑ بن میں وہ کب گھر پہونچ گئی۔

—•—

کچھ دن کے بعد دیپک کے رشتہ دار گاؤں سے آگئے۔ وکیل صاحب نے مہمانوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مہمان خوشی میں پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کیونکہ ان کے گاؤں

کا ایک غریب لڑکا شہر کے ایک بڑے وکیل کی لڑکی سے شادی کر رہا تھا لیکن انہیں کیا علم تھا کہ اس شادی کے پس پردہ کیا راز ہے۔ دراصل وکیل صاحب کی ناز و نعم میں پلی لڑکی لنگڑی تھی۔ اس کا ایک پاؤں پولیو زدہ تھا۔ لیکن گاؤں میں یہ سب کون دیکھتا ہے۔ دراصل دولت کی مارنے غریب کا منھ بند کر دیا تھا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ دیپک کے رشتہ دار بڑے فخر و مسرت سے پھولے نہیں سمائے۔ شادی کی گہما گہمی اختتام کو پہونچی تو نہایت عزت و احترام سے تمام مہمانوں کو وداع کیا گیا لیکن دیپک وکیل صاحب کے یہاں رہ گیا۔

وکیل صاحب بڑے جہاندیدہ شخص تھے، انہوں نے شادی سے پہلے ہی اپنے اثر و رسوخ سے دیپک کی ملازمت کا انتظام کر دیا تھا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد دیپک سلطان گنج گریجویٹ کالج میں پروفیسر ہو گیا۔

سیدھے سادے دیوتا صفت منوہر بابو دیپک کو ہونہار اور ایماندار لڑکا سمجھتے رہے لیکن اس نے وکیل صاحب کا داماد بنکر ان کی تمام ہمدردیوں، شفقت اور محبت کو یکسر فراموش کر دیا۔ انہیں سان و گمان بھی نہیں تھا کہ گاؤں کا سیدھا سادا لڑکا اتنا پتھر دل اور احسان فراموش نکلے گا۔ وہ اس جانکاہ صدمہ کو زیادہ دن تک برداشت نہیں کر سکے۔ اور بہت جلد اس ناپائیدار دنیا کی جھوٹی محبتوں سے چھٹکارہ پا لیا۔

اسی دوران سنگیتا نے رات دن سخت محنت کر کے بی۔ایڈ کر لیا تھا۔ چونکہ میونسپلٹی کے چیرمین منوہر بابو کو بہت چاہتے تھے اسلئے انہوں نے سنگیتا کو اپنی سفارش سے مقامی گرلس اسکول میں سائنس ٹیچر کی حیثیت سے بحال کرا دیا علاوہ بریں اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے لئے رکھبی مقرر کر دیا۔

ایک دن اس نے اخبار میں اشتہار دیکھا کہ آدی واسی کرسچن گرلس ہائی اسکول رانچی میں ماسٹر کی ضرورت ہے۔ درخواستیں پندرہ دن کے اندر ہیڈ مسٹریس کے نام آنی چاہئیں۔ سنگیتا نے بھی درخواست لکھ کر بھیجدی۔ انٹرویو کیلئے اسے بھی بلایا گیا۔ انٹرویو میں سنگیتا اچھے نمبروں سے کامیاب ہوگئی۔ اسے بحال کر لیا گیا۔ وہ مقامی اسکول

کی ملازمت کو استعفا دیکر راںچی چلی آئی اور یہاں آدیواسی گرلس ہائی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ نیا ماحول ہونے کے باوجود یہاں کے لوگ پرخلوص اور انتہائی روادار تھے۔ اسے رہنے کے لئے کوارٹر بھی مل گیا تھا۔

خوش قسمتی سے یہاں ایک اسکولی دوست ساوتری سے اسکی ملاقات ہوگئی۔ ساوتری اسی اسکول میں ٹیچر تھی۔ بڑی دلچسپ اور پرمذاق لڑکی تھی۔ سنگیتا اسے اپنے گھر لے گئی اور اپنی ماں سے تعارف کرایا۔ اس کی ماں ساوتری سے ملکر بہت خوش ہوئے۔ اب وہ اکثر اس کے یہاں آنے جانے لگی تھی۔

اتوار چھٹی کے دن سنگیتا اور ساوتری شاپنگ کرکے گھر واپس جانے کیلئے بس اسٹینڈ پر بس کا انتظار کر رہی تھیں۔ پاس کی کلینک سے ایک نوجوان، بچی کو گود میں لئے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا بس اسٹینڈ کے قریب آگیا۔ اس کا عجیب حلیہ تھا۔ بکھرے ہوئے بال، بکھرے ہوئے، چہرے پر مایوسیوں کی بوجھل پرچھائیاں پھیلی ہوئیں ایسا لگتا تھا کہ وہ دنیا کی رغبت سے بیزار ہو چکا ہو۔ اچانک ایک دوسرے کی نظریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ سنگیتا یکلخت کسی غیر مرئی خوف سے سہم گئی۔ نوجوان قریب آکر نہایت نرم لہجہ میں بولا" مجھے پہچانا تم نے ؟ میں دیپک ہوں۔

سنگیتا نے سنی ان سنی کردی کوئی توجہ نہیں دی۔

اس نے پھر گھٹی گھٹی سی ہوئی آواز میں کہا" میں دیپک ہوں سنگیتا"۔

"میں نہیں پہچانتی" سنگیتا نے نہایت بے مروتی سے جواب دیا۔

ساوتری دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔

معاف کرنا سنگیتا میری غلطی کی جو بھی سزا دو، مجھے منظور ہے۔" اسکا چہرہ شدتِ پشیمانی اور خفت سے بوجھل تھا۔ اس نے احساسِ ندامت سے پھر کہا۔" میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت چکا ہوں سنگیتا۔ دیکھو، میری اس بدنصیب معذور بچی کو پیدا ہوتے کے ایک سال بعد ہی اسکی ماں بھگوان کو پیاری ہو گئی۔ اس بچی کو تین سال ہو گئے لیکن اب تک یہ ہوش میں نہیں آسکی۔ کئی ڈاکٹروں کو

دکھلایا کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اب یہاں کوئی چھ مہینے سے اس ڈاکٹر سے علاج کرا رہا ہوں۔ سنا ہے یہ ڈاکٹر اس مرض کا اسپیشلسٹ (Specialist) ہے۔ سنگیتا میں تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں مجھے معاف کر دو بھگوان کے لئے معاف کر دو" دیپک کی آواز بھرا گئی۔ چنداں توقف کے بعد بھیگی آواز میں بولا۔

"تم یہاں کیسے آئیں؟ گھر میں ماتا پتا اچھے ہیں نا؟

" گھر پتاجی کے ساتھ چلا گیا" اس کے لہجہ میں بے رخی کا عنصر نمایاں تھا۔

"اب ہم دونوں ماں بیٹی دنیا کے غم و آلام جھیلنے کے لئے زندہ رہ گئی ہیں۔ کسی طرح بھگوان کی مہربانیوں سے میں یہاں اسکول میں ٹیچر ہو گئی ہوں۔

"کسی دن میں چاچی سے معافی مانگنے آؤں گا؟"

"ہرگز نہیں تم جیسے بے اعتماد، مکار شخص کو وہ ایک نظر دیکھنا نہیں چاہتیں۔ ......"

اتنے میں بس آ گئی، سنگیتا اور ساوتری ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بس پر چڑھ گئیں۔

بس فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی، دیپک وہیں کھڑا اس کی دھول کو دیکھتا رہا۔

ممتا کی تجلی

میں حیران تھا کہ نریش کو ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا جو مجھے اسی وقت بلایا ہے۔ شاید پائل سینما میں جو نئی پکچر "رام تیری گنگا میلی" لگی ہے اسے دیکھنے کا ارادہ ہے۔ میں نے دفتر سے ہی شاردا کو فون کر دیا کہ گھر ذرا دیر سے آؤں گا۔ اور سیدھا نریش کے دفتر چلا گیا۔

"آؤ یار بیٹھو، تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" نریش کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ چپراسی کو دو چائے لانے کو کہہ کر میرے پاس ذرا کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "دیکھو ونود برا نہیں ماننا، پچیس سال پہلے بھابی نے ایک اپاہج بچے کو جنم دیا تھا۔ ہم دونوں اسے ایک اناتھ آشرم میں دے آئے تھے یاد ہے نا؟"

"ہاں اچھی طرح یاد ہے" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ بھابی کو ہم نے کہہ دیا تھا کہ ہم اسے مندر کے ایک کونے میں رکھ آئے مگر وہاں سے کوئی اسے لے گیا۔"

"ہاں یاد ہے، لیکن شاردا کے کہنے پر ہی ہم نے ایسا کیا تھا۔" میں حیرت میں پڑ گیا کہ یہ پرانا قصہ کیوں شروع کیا جا رہا ہے۔

"بھلے بھابی کے کہنے پر ہی ہم نے ایسا کیا تھا مگر آج بڑی مزیدار بات ہو گئی ہے۔ ہمارے دفتر میں ایک اپاہج انجینئر کی بحالی ہوئی ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو دنگ ہو جاؤ گے۔ بالکل تمہارے جیسا ہے۔ شکل و صورت کو کیا تمہارے گالے

پر جس جگہ تل ہے ٹھیک اسی جگہ اس کے بھی تل ہے اور جانتے ہو اسکی پرورش بھی اسی اناتھ آشرم میں ہوئی جس میں تمہارے اپاہج بچے کو تم چھوڑ آئے تھے۔

"یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ہمارا ہی لڑکا ہو۔"

"یہ میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ تمہارا لڑکا ہے۔ شاید ہو بھی سکتا ہے' اچھا بتاؤ کیا تم اس دن کے بعد کبھی اناتھ آشرم گئے تھے؟"

"نہیں کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

"کیا تم اس لڑکے سے پھر کبھی ملے؟"

"نہیں ــــ"

"پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تمہارا لڑکا نہیں ہے؟ خیر ــــ اس وقت تو وہ یہاں نہیں ہے۔ کل تم آکر اسے ضرور دیکھ لینا' شاید تمہیں اپنی کچھ جھلک اس میں دکھائی دے۔"

میں ان ہی خیالات کے تانے بانے میں کب گھر آگیا کچھ پتہ نہ چلا اور اتنا بھی یاد نہیں کہ اسکوٹر میں تیل ڈلوانے کے بعد باقی پیسے واپس لئے تھے یا نہیں جب شاردا نے چائے لاکر میز پر رکھی تو مجھے ذرا ہوش آیا۔ چائے پیتے پیتے میرا دھیان پھر اس لڑکے کیطرف چلا گیا۔

جب ہمارا پہلا بچہ ہونے والا تھا تو ان دنوں شاردا کو چیچک ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کا اثر بچہ پر بھی پڑ سکتا ہے لیکن اس حالت میں حمل ضائع کرانا مناسب نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ بچہ اپاہج یا مفلوج ہو سکتا ہے۔ شاردا کو بہت دکھ تھا۔ وہ دل ہی دل میں پرارتھنا کرتی تھی کہ اپاہج بچہ کو جنم دینے کے بدلے اگر مرا ہوا بچہ پیدا ہو تو بہتر ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے ایک اپاہج بچے کی پرورش کرنی پڑے۔ بہر طور بچہ جب پیدا ہوا تو پتہ چلا کہ اس کی دونوں ٹانگیں خراب ہیں۔ شاردا نے مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اس بچے کو اسکو دیکھنے سے پہلے ہی کہیں چھوڑ آؤں۔ لیکن چونکہ بچہ کو اسپتال سے گھر لانا ہی تھا اس لئے شاردا

بچہ کی ولادت کے لئے دوسرے شہر کے اسپتال میں داخل ہوئی تھی تاکہ وہ گھر آکر سب کو یہ بتادے کہ مرا ہوا بچہ پیدا ہوا تھا۔ صرف نریش اس راز کو جانتا تھا۔ کیونکہ میں اسے اپنے ساتھ مدد کے لئے لے گیا تھا۔ بہرنوع اپاہج بچہ کو لیکر ہم اسی شہر کے ایک مندر میں چھوڑنے چلے گئے لیکن مندر میں ہمیں ایسی کوئی جگہ نہیں دکھائی دی جہاں بچہ کو چھوڑ سکیں۔ ویسے نریش بچہ کو مندر میں چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا لیکن شاردا کے اصرار پر ہم مجبور تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اپاہج بچہ کی وجہ سے اس کی پرسکون زندگی میں نت نئی پریشانیاں پیدا ہوتیں انہیں وہ پہلے ہی ختم کر دینا چاہتی تھی علاوہ بریں وہ ایک اپاہج بچہ کو گلے میں لٹکائے دوسروں سے مدد کی بھیک مانگنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ سر اونچا کر کے چلنے والی ایک خوددار عورت تھی اور اپنے آپ کو بدنامی کا داغ لگانا کبھی نہیں چاہتی تھی۔

●

میں اور نریش کوئی دو گھنٹہ مندر کا چکر لگاتے رہے لیکن کہیں کوئی مناسب جگہ نہیں دکھائی دی۔ آخر نریش نے صلاح دی کہ ہم بچہ کو کسی اناتھ آشرم میں چھوڑ آئیں اور شاردا کو کہدیں کہ بچہ کو مندر میں چھوڑ آئے ہیں۔ صلاح معقول تھی۔ میں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ شاردا کو بغیر بتائے بچہ کو اناتھ آشرم میں دینا ہی بہتر ہے۔

اگلے دن ہم اناتھ آشرم گئے وہاں جھوٹ بتایا کہ بچہ کے ماں باپ کی ایک حادثہ میں موت ہو گئی، ہم اس بچہ کو آشرم میں دینا چاہتے ہیں اگرچہ بچہ کو چھوڑتے وقت مجھے بہت دکھ ہوا لیکن جب ماں ہی پالنے کو تیار نہ ہو تو باپ کیا کرے۔ جب ہم بچہ کو چھوڑ آئے تو شاردا ساری رات روتی رہی۔ کچھ دن بعد ہم اپنے شہر واپس آگئے۔ یہاں سب کو یہی بتایا گیا کہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا لیکن حقیقت صرف مجھے اور نریش کو معلوم تھی حتیٰ کہ شاردا کو بھی خبر نہ تھی۔

ایک سال بعد شاردا نے ایک اور بچہ کو جنم دیا۔ ہم نے بڑے چاؤ سے بچہ کا نام ارجن رکھا۔ وہ خاصا تندرست اور خوبصورت تھا۔ شاردا ایسا ہی بچہ چاہتی

تھی۔ خوب دھوم دھام سے اس کی نام رکھائی کی گئی۔ ارجن کی پیدائش کے ۲ سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام لکشمی رکھا گیا۔ اب ہماری زندگی خوشی خوشی گزرنے لگی تھی۔ اب اس اپاہج بچہ کی یاد ہمارے دل سے قطعی مٹ چکی تھی۔ غیر متوقع طور پر آج نریش نے پھر اس بچہ کے بارے میں بات چھیڑ کر میرے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ دماغ میں مختلف خیالات نشتر زنی کر رہے تھے۔ جو بات پچیس سال تک شاردا کو نہیں بتائی گئی اسے کب تک چھپایا جا سکتا تھا۔ اب میرا دل بھی اس اپاہج بچہ کیلئے نہ جانے کیوں بے چین ہو رہا تھا۔ آج کی رات بھی اسی طرح کروٹیں بدلتے بیت گئی۔

میں سویرے ہی نریش کے دفتر جا پہنچا۔ مجھے اپنے دفتر میں خلاف توقع دیکھ کر اس نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا بات ہے آج صبح سویرے چلے آئے کیا منوج اب بہت یاد آرہا ہے؟"

"منوج" میں ہکا بکا ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ہاں منوج' اس اپاہج لڑکے کا نام منوج ہی ہے"۔ پھر اس نے چپراسی سے منوج کو اندر بلوایا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ٹک ٹک کی بے ربط آواز قریب آتی جارہی تھی۔ بیساکھیوں کے سہارے منوج آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں دم بخود رہ گیا۔ بالکل میرا روپ تھا۔ اس کی ٹانگیں بیل باٹم کے نیچے چھپی ہوئی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ مکمل سوکھی ہوئی ہیں۔ پیروں میں جوتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا میں لٹک رہے ہوں۔ مگر جسم کا اوپری حصہ خاصا دلکش اور قابل رشک تھا۔

"آپ نے مجھے بلایا صاحب؟" اس نے انتہائی ادب سے نریش سے کہا۔

ہاں منوج' ان سے ملو' یہ ہیں ونود جی' ہمارے چیف انجینئر' تم سے کچھ پوچھنا چاہیں گے"۔

میں خود حیران و ششدر تھا' اس سے کیا پوچھتا۔ اس کا چہرہ بشرہ میری

کمزوری کی علامت تھا۔ بمشکل تمام میں اپنے حواس پر قابو پا سکا تو اس سے پوچھا۔
"تم نے انجینئرنگ کہاں سے پاس کی؟"
"جودھپور سے۔"
"کیا تمہارے ماں باپ بھی وہیں رہتے ہیں؟"
"جی نہیں، میرے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔"
"تو پھر تمہاری پرورش؟"
"میری پرورش اناتھ آشرم میں ہوئی ہے۔"
"تمہارے ماں باپ کا انتقال کیسے ہوا؟" میں نے سیدھا سوال کیا۔
"میں نہیں جانتا صاحب، لوگ کہتے ہیں، میری پیدائش کے کچھ دن بعد کار کے حادثہ میں ان کی موت ہو گئی۔"

میں یکلخت شرم و ندامت سے گڑ گیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا: "منوج تم اپنے سامنے بیٹھے باپ کو رد ہ بتا کر اس کا دل کتنا چھلنی کر رہے ہو۔ افسوس یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتا مگر لہو پکار ہی لیتا ہے۔ میں اب تک سمجھتا تھا کہ میرے دو ہی بچے ہیں لیکن یہ بھول گیا تھا کہ ایک اور بچے میں بھی میرا خون شامل ہے۔"

میں بجھا بجھا سا گھر لوٹ آیا۔ پھر دفتر جانے کا ارادہ ہی نہیں ہوا۔ خلاف توقع میرے جلد واپس آجانے سے شاردا گھبرا سی گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس راز سے پردہ اٹھا دوں تو شاردا پر کیا گذرے گی لیکن اسے بتانا بھی ضروری تھا۔ آخر کار اپنے سینے پر صبر کا پتھر رکھ کر میں نے اس سے تمام واقعہ من و عن کہہ سنایا۔ شاردا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکے جا رہی تھی اور درد و کرب سے بیتاب ہو کر ہچکیاں لے رہی تھی۔ آخر وہ بے ضبط ہو کر ہچکیوں کے درمیان چیخ پڑی۔

"پچیس سال کے بعد تم مجھے یہ بات بتاتے ہو؟"
"میں تمہیں آج بھی نہیں بتاتا شاردا۔ اگر منوج میرے سامنے نہ آیا ہوتا۔"

"ہاں تم مجھے کیوں بتاتے، میں کون ہوتی ہوتی ہوں۔" شاردا بری طرح رو رہی تھی۔
"تمہیں بتا کر کرتا بھی کیا۔ جس اولاد کا غم پچیس سال تک میں اپنے سینے میں چھپائے پھرتا رہا، تمہیں اس کا کیا احساس ہو سکتا ہے؟ مجھے اپنے بچے کا غم نہیں؟ اس کے جنم دن کے بعد سے میرا ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے اس کی جدائی کا غم محسوس نہیں کیا ہو۔ کیا یہ سچ نہیں کہ سب کچھ تمہارے اصرار پر ہوا تھا! تم نے اس وقت میری ایک نہ سنی، اگر میری بات سنی ہوتی تو ہمارے بچہ کا یہ حال نہ ہوتا۔" میں چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

میں قصداً رات دیر سے آیا مگر شاردا میرا انتظار کر رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی فوراً کھانا چن دیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"کیا تم مجھے میرے بیٹے سے ملا دو گے؟"
"تمہارا بیٹا ــــــ؟"
"میرا بیٹا نہ سہی مگر مجھے اس سے ملا تو دو۔"
"مگر وہ تو اپاہج ہے۔"
"اپاہج کیا کسی کا بیٹا نہیں ہوتا؟"
"پچیس سال پہلے تو تم اسے اپنا بچہ کہنے کیلئے تیار نہیں تھیں۔"
"ہاں پچیس سال پہلے وہ میرا بیٹا نہیں تھا یہ میری بھول تھی۔" شاردا کی آنکھیں دفور غم سے بھر آئیں۔
کھانا کھانے کے بعد میں سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ پلنگ پر لیٹے سوچنے لگا یہ بات اگر میں منوج کو بتا دوں تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ پھر سوچا کہ ایک اناتھ بچے کو اچانک اس کے ماں باپ مل جائیں تو اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ اب میں اس سربستہ راز کو فاش کر دینا چاہتا ہوں اس معاملہ میں نرلیش میری مدد کر سکتا ہے۔ میں نرلیش سے کہوں گا کہ وہ منوج کو میرے بارے

میں سب کچھ بتا دے، لیکن نرلیش بات ٹھیک نہ کہہ سکا تو منوج ہم سے پھر الگ ہو جائے گا۔ آخر ش میں نے ان تمام خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ بذات خود اس سے بات کروں گا اور اس مصنوعی اندھیرے کو حقیقت کے چراغوں سے روشن کرنے کی کوشش کروں گا۔

دوسرے دن میں نے اسے ایک مہمان کی حیثیت سے گھر پر بلایا۔ باتوں باتوں میں نے منوج سے شاردا کا تعارف کراتے ہوئے کہا " یہ میری بیوی ہیں، شاردا اگر تم چاہو تو انہیں اپنی ماں بھی کہہ سکتے ہو۔"

شاردا منوج کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اپنی محویت کے عالم میں وہ چائے پلانا بھی بھول گئی۔ چنداں توقف کے بعد میں نے ہمت کرکے منوج سے پوچھا۔

" اگر آج تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں تو تم کیا کروگے؟"

اس نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا " کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

اس کے اس بے نیازانہ انداز کو دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ اس نے مزید کہا۔

" جو ماں باپ اپنے قریب ایک مہینہ کے مفلوج بچہ کو اناتھ آشرم میں چھوڑ سکتے ہیں تو اس کا زندہ رہنا یا نہ رہنا برابر ہے۔"

میرے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا روکھا جواب دے گا۔ شاید وہ اپنی زندگی میں زمانہ کا نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ جس کا اسکو تلخ تجربہ تھا۔ میں نے لوٹتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ " لیکن ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہو سکتی ہیں۔"

" اگر میں کہوں کہ میرا پیٹ سب سے بڑی مجبوری ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اسے کاٹ کر پھینک دیا جائے۔"

میں لاجواب ہو گیا۔ چند لمحوں کے لئے، ماحول پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پھر کہا۔ " میں جانتا ہوں، آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔"

"کیوں ۔۔۔؟" میں کچھ خفیف سا ہو گیا۔

"کیونکہ آپ بھی ایک اپاہج کے باپ ہیں اور وہ اپاہج میں ہوں۔"

"کیا کہا، یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟" میں ہکا بکا ہو کر اسکا منھ تکنے لگا۔

"نریش صاحب نے۔" اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

احساس ندامت سے میرا چہرہ دھواں ہو گیا اور شاردا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

جب جذبات غم تھا تو وہ منھ بسورتے ہوئے بولی۔ "ہاں بیٹا تم ہمارے ہی بیٹے ہو، میری ہی وجہ سے تمہارے باپ تمہیں اناتھ آشرم میں چھوڑ آئے تھے۔ تم مجھے معاف کر دو بیٹا۔" اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ منوج کے سر پر پھیرتے ہوئے مزید کہا۔ "کیا بتایا نریش نے تمہیں؟"

"وہ سب کچھ جو آپ کی ممتا نے اپنے اپاہج بچہ کیلئے گوارا کیا۔"

"یہ ہماری بھول تھی بیٹا، اس وقت ہماری عقل پر پردے پڑ گئے تھے۔ بھگوان کے لئے اپنے آپ کو اپاہج کہکر ہمارے دل کو کچوکے نہ لگاؤ۔" شاردا کو آج اپنی بزدلی اور بے حسی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔

"میں نے کب اپنے آپ کو اپاہج کہا۔ بھگوان کی دیا سے منوج کبھی اپاہج تھا نہ ہو گا۔" اسنے کمال تمکنت سے کہا۔ "اپاہج آپ لوگ ہیں جو اپنے خون کو اناتھ آشرم میں دے آئے۔ اپاہج وہ ماں تھی جس کے دل میں ممتا کا مطلق احساس نہ تھا۔ اپاہج وہ باپ تھا جس نے اپنے بیٹے کی پرورش سے منھ چرایا تھا......" نفرت اور کرب کے ملے جلے جذبات سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اپنی بیساکھیوں کے سہارے کمرے سے نکل گیا۔ اسے روکنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

آخری فیصلہ

کاجل شام کو دفتر سے آئی تو پلنگ پر کوئی خط پڑا ہوا ملا۔ وہ خط اٹھا کر پڑھنے لگی۔ خط اس کی عزیز سہیلی پونم کا تھا۔ اس نے چائے پر بلایا تھا۔ دفتر کے کپڑے اتار کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ پھر سر جھاڑ کر کپڑے بدلے۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر میک آپ کرنے لگی۔ اتنے میں ماں نے باورچی خانے سے آواز دی۔

"بیٹا چائے پی لو ـــ"

"میں ابھی چائے نہیں پیوں گی ماں، میں پونم کے یہاں جا رہی ہوں۔ اس نے چائے پر بلایا ہے مجھے۔"

جب وہ پونم کے یہاں پہونچی تو دیکھا پونم اور اس کی ماں کسی شخص سے باتیں کر رہی تھیں۔ کاجل ایک انجانے شخص کو دیکھتے ہی جھجک کر دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ پونم فوراً اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔ اور پاس کرسی پر بٹھا لیا۔ پھر اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یہ پروفیسر سروج ہیں کاجل، ہمارے کالج کے نئے لیکچرر ـــ"

کاجل نے نظریں نیچی کر لیں۔ پونم نے پھر سروج سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ میری بچپن کی سہیلی کاجل ہے۔"

سروج کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی چمک پھیل گئی اور اخلاقاً کہا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے کاجل، تمہارے بارے میں مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم دفتر میں کام بھی کرتی ہو، واقعی تم بہت عقلمند لڑکی ہو،

تم جیسی سمجھدار لڑکیاں سماج اور ملک کے لئے ایک غیر معمولی کردار ادا کرتی ہیں۔
میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ آج کی لڑکیاں چار پیسے کمائیں تاکہ وہ دوسروں
پر تکیہ کرنے کے بجائے خود کفیل ہو سکیں۔"

کاجل شدتِ حیا سے سمٹی ہوئی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کسی اجنبی سے یک
بیک بے تکلفی سے بات کرنا اس کی عادت میں نہیں تھا۔ اس کی ایک ہی بے تکلف
سہیلی پونم تھی۔ جس سے وہ اپنے دل کا راز بھی بتا دیتی تھی۔ وہ کوئی آدھ گھنٹہ
وہاں بیٹھی رہی بالکل خاموش تھی۔ پھر اچانک پونم کی ماں سے سرگوشی میں کہا۔

"میں جا رہی ہوں چاچی"۔ وہ چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر جانے
کیلئے کھڑی ہو گئی۔

سروج نے فوراً چٹکی لی" اچھا آپ بول بھی لیتی ہیں، میں تو کچھ اور ہی
سمجھا تھا۔" اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔

"پونم۔۔ کاجل جا رہی ہے۔" ماں نے پونم کو آواز دی جو باورچی خانے
میں تھی۔

"کچھ دیر بیٹھو نا کاجل، ایسی بھی کیا جلدی پڑی ہے۔" پونم نے جھپٹ
بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر دونوں باورچی خانے میں چلی گئیں۔

کاجل نے ناگوار لہجہ میں کہا۔" یہ کون گنوار آدمی تمہارے یہاں آیا ہے؟"

"ارے کیا کہہ رہی ہو تم، وہ پروفیسر ہیں"۔

"بڑا پروفیسر آیا ہے، بیہودہ کہیں کا، بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں
جانتا، خیر میں جا رہی ہوں، پھر ملوں گی۔"

دونوں کی آنکھیں یکلخت چھلک گئیں اور کاجل بوجھل قدموں سے
آہستہ آہستہ چلی گئی۔

دیکھتے دیکھتے دو سال پر لگا کر اڑ گئے، ایک دن دفتر جاتے ہوئے
راستہ میں کاجل کی پونم سے ملاقات ہو گئی۔ باتوں باتوں میں کاجل نے کہا۔

"میں نے سروج سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، پونم"

"سچ میری قسم؟" پونم یکلخت جھوم گئی اور بے اختیارانہ بولی۔ "ہمیں تو پتہ بھی نہیں چلا اور بات شادی تک پہنچ گئی" ارے، اس دن تو تم اسے نہیں گنوار، بیہودہ اور کیا کیا کہہ رہی تھیں، یہ کیسی کایا پلٹ ہوگئی، تمہارے ماں باپ راضی ہیں؟"

"راضی ہوجائیں گے، سروج دو ایک دن میں میرے گھر آنے والے ہیں"۔ پھر اس نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا میں جارہی ہوں پونم، دفتر کا وقت ہوگیا"۔ اور وہ دفتر کی طرف مڑ گئی۔

●

پانی پی کر گلاس تپائی پر رکھتے ہوئے سروج نے نہایت احترام سے کہا "بابوجی، آپ کو میرا خط مل ہوگا۔ میں اسی سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں"۔

"اوہو، تم کاجل کا ہاتھ مانگنے آئے ہو، میری اجازت چاہتے ہو" کاجل کے باپ کے لہجہ میں تلخی پنہاں تھی۔

"جی ہاں باپ کی اجازت کے بغیر۔۔۔۔۔؟"

فوراً اس کی بات کاٹ کر کاجل کے باپ نے کہا "میں خوب سمجھتا ہوں بھولی بھالی لڑکی کو دیکھ لیا تو ڈورے ڈالنا شروع کر دیئے"۔

"بابوجی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ راضی نہیں ہیں تو انکار کر سکتے ہیں لیکن کسی کی توہین نہیں کر سکتے"۔

"میں جانتا ہوں، تم ایک عارضی پروفیسر ہو، وہ تمہاری مستقل اسامی نہیں ہے؟"

"مستقل ہوجائیگی بابوجی، آپ یقین کیجئے"۔

"اس کی کوئی ضمانت نہیں، میں اپنی لڑکی کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا"۔

"خیر۔ آپ کی مرضی لیکن ایک بات سن لیجئے بابوجی، کاجل میرے سوا کسی سے بیاہ نہیں کرے گی"۔ اور وہ جھٹ اٹھکر باہر چلا گیا۔

سروج کے جاتے ہی گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ کاجل کی ماں بین کر کر کے رو رہی تھی۔ "کیا معلوم تھا کہ ہماری ہی اولاد ہماری ناک کٹوائے گی۔ وہ بے غیرت بے ایمان کتنی شان سے کہکر چلا گیا کہ کاجل اس کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ بڑا آیا رئیس زادہ نہ صورت، نہ شکل، اپنے خاندان کا بھی نہیں۔ کاجل جیسی میری لڑکی کے لیے کیا لڑکوں کی کمی ہے۔ ایک سے ایک لڑکا مل سکتا ہے۔"

آج کاجل کو پہلی بار محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کتنی مجبور ہے۔ اسکے جذبات پر کتنے سخت پہرے لگے ہوئے ہیں۔ اس کا دل پانی میں بتاشے کیطرح بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو قطار در قطار بہے جا رہے تھے۔ وہ دیوار سے لگ کے پتھر کی مورتی کیطرح خاموش بیٹھی رہی۔

—•—

ایکدن پونم نے کاجل کو اپنے گھر بلایا۔ وہ دفتر سے سیدھے اس کے یہاں چلی گئی۔ پونم اور اس کی ماں سروج سے باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں دیکھکر کاجل سٹ پٹا کر دہلیز میں کھڑی ہو گئی۔ پونم نے جھٹ اسے لا کر اپنے پاس بیٹھا لیا اور کہا۔

"کاجل معلوم ہوا تمہارے پتاجی خفا ہیں، ارے تم گھبراؤ نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ لوگ پرانے خیال کے ہیں۔ وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے مگر تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، باشعور ہو لیکن جو بھی فیصلہ کرو بہت سنجیدگی سے کرو۔ کیونکہ یہ تمہاری آئندہ زندگی کا سوال ہے۔ اور سنو، سروج بھی تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

کاجل کی نظریں فرش پر جھکی ہوئی تھیں۔ سروج نے بڑے صبر و تحمل سے کہا کاجل اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں کہ ہم یا سول میرج کر لیں یا ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لئے بھول جائیں، لیکن اب میں تمہارے گھر کبھی نہیں جا سکتا۔ اب فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے۔"

سروج کا حتمی فیصلہ سنتے ہی کاجل بدحواس سی ہوگئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوگئیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کیا جواب دے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی، پھر اس نے اپنا دل کڑا کر کے بھیگی آواز میں کہا۔

"مجھے معاف کرنا سروج، اپنے ماں باپ کے فیصلہ کے خلاف میں شادی نہیں کرسکوں گی۔"

کاجل کا دو ٹوک جواب سنکر سب کے اوسان خطا ہوگئے اور کمرے میں ایک پر موت کا سناٹا چھا گیا۔ آخر بمشکل تمام سروج نے مایوس لہجہ میں کہا۔

"اچھا تو اب مجھے اجازت دو میں چلا"۔ وہ اپنے درد اور سوز سے سلگتے ہوئے دل کو سنبھالے لو جھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

کاجل پتھر بنی بیٹھی رہی، جیسے کسی نے آنکھوں کی راہ سے روح نکال لی ہو۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دو راہ گیر اپنی راہ چلتے چلتے اتفاق سے ایک ہی راہ پر آ گئے اور کچھ دور ساتھ چل کر پھر الگ ہوگئے ہوں۔

●

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کاجل کے باپ نے بہت جلد ایک متوسط گھرانے میں اس کی شادی کر دی۔ کاجل بیاہ کر لوین کے گھر چلی گئی۔ شادی کے بعد کچھ دن بڑی ہنسی خوشی سے گزرے، پھر اچانک جہیز کا معاملہ لیکر آپس میں تکرار شروع ہوگئی۔ اور بات بات میں کاجل پر طعنوں کے پتھر پھینکے جانے لگے۔

گھر کی بہو صبح دیر تک سوئے رہتی ہے۔ گھر میں سویرے جھاڑو نہیں دی جاتی۔ کھانا وقت پر تیار نہیں ہوتا۔ بچے اکثر بھوکے اسکول چلے جاتے ہیں۔ گھر کا کوئی کام سلیقہ سے نہیں ہوتا۔ دن پر دن گھر میں نحوست بڑھتی جا رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بیچاری کاجل روزانہ ساس کی جلی کٹی باتیں سن سن کر دھاروں دھار روتی رہتی، شام کو آفس سے آنے کے بعد جب وہ رات گئے بستر پر جاتی تو اس کا

سارا بدن ٹوٹتا ہوا لگتا اور پھر رات کو نیند کبھی سکون سے نہیں آتی۔ ساس اپنے پرانے دمہ کی وجہ سے رات بھر کھانستی رہتیں۔ ہتھوڑے برسانے والی کھانسی کی وجہ سے کسی کو نیند نہیں آتی۔

ایک دن کاجل دفتر سے آکر کپڑے بدل رہی تھی کہ اسے ساس کی دھیمی آواز سنائی پڑی وہ نوین کو بلا رہی تھیں۔

"کاجل سے پوچھو، اس نے ابھی تک تنخواہ نہیں دی، گھر میں سو طرح کے خرچ ہیں۔ اگر سبھی اپنی اپنی تنخواہ جیب میں رکھ کر بیٹھ جائیں تو گھر کا کام کیسے چلے گا۔"

"اچھا ماں، میں پوچھوں گا۔"

"پوچھنا کیا ہے بچے تنخواہ دے جائے۔ جانتے ہو کل دودھ والا حساب مانگ رہا تھا۔ گھر میں کوئلہ نہیں ہے۔ چینی ختم ہو رہی ہے۔"

نوین ایک عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ پھر کچھ دیر سوچ کر بڑی سعادت مندی سے کہا۔

"ماں ایک کام کیا جائے، برا نہیں ماننا، گھر کی پریشانیاں تو تم دیکھ رہی ہو اور ان سردیوں میں تمہارے دمہ کی تکلیف روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ کیوں نہ ایک نوکر رکھ لیا جائے، تمہاری خدمت کرے گا اور گھر کا کام بھی کرے گا۔"

"اچھا ـــــ اب تمہیں ماں کا درد محسوس ہو رہا ہے۔ پانچ سال سے یہ موذی مرض میری جان کھائے جا رہا ہے تب کبھی نوکر رکھنے کا خیال نہیں آیا تھا ـــ بیٹے میں خوب سمجھتی ہوں، بیوی کے آرام کیلئے اب ماں کی بیماری کا بہانہ بنایا جا رہا ہے۔ برتن بالس صاف کرنے تو نوکرانی آتی ہی ہے پھر ایک اور نوکر کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تمہاری بیوی دو روٹیاں بھی نہیں سینک سکتی؟"

"وہ دفتر میں بھی کام کرتی ہے ماں۔"

"میں سمجھتی ہوں، مجھے مت سمجھاؤ، میں جب اس عمر کی تھی تو ایک بھرے پرے گھر کی ساری ذمہ داریاں اکیلی سنبھالتی تھی، اپنے چار بچوں کے علاوہ تین نند کے

تین دیوَر اور ایک بوڑھے سسر گھر پر موجود تھے۔ تمہاری بیوی کو گھر کے کام کاج سے دلچسپی ہے ہی نہیں۔"

ماں کے الجھے تیور دیکھ کر نوین چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کاجل کو دروازے پر دیکھ کر کہا۔

"کاجل ماں تنخواہ مانگ رہی ہیں۔"

"ہاں میں نے سن لیا ہے۔" کاجل کو نوین کی بے بسی پر ترس آ گیا۔

جب وہ ساس کو اپنی تنخواہ دیکر لوٹنے لگی تو انہوں نے نرم لہجہ میں کہا۔

"بہو، یہ لو تمہارا جیب خرچ" کاجل ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور روپے لیکر چلی آئی۔ جب پلنگ پر بیٹھ کر گننے لگی تو پچاس روپے تھے۔ وہ روپوں کو کچھ دیر کربناک نظروں سے دیکھتی رہی پھر یک بیک اس کے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ پڑا۔ جانے کب کا رکا ہوا سیلِ رواں اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ وہ روتی رہی اور نوین سمجھاتا رہا مگر اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا واقعی عورت کا دوسرا نام ایثار ہے قربانی ہے۔
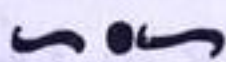
بس کے انتظار میں کاجل بس اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تو پونم مسکرا رہی تھی۔

"ارے پونم" کاجل کے متحیر چہرے پر تبسم کا ہلکا سا عکس ہوا کے جھونکے کی طرح آیا اور چلا گیا۔

"تم پٹنہ نہیں گئیں۔؟" پونم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھی تھی کہ تم پٹنہ چلی گئیں۔ چار سال بیت گئے اپنی شکل تک نہیں دکھائی۔"

"کیا کہوں پونم۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "کسی دن فرصت سے بتاؤں گی۔"

"آج کیوں نہیں، چلو میرے ساتھ، آج میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔"

"نہیں پونم، اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی، آجکل ذرا ذرا سی بات

پر طوفان بچ جاتا ہے۔"

"پرواہ نہیں۔ میرے لئے آج طوفان کا مقابلہ کر لینا۔"

"چلئے نا چاچی —" اچانک پونم کے پیچھے کھڑا ایک بچہ بولا

"کون ہے یہ پونم؟" کاجل نے چونک کر پوچھا۔

"میرا لڑکا ہے، بہو —"

"اچھا —! تمہارا لڑکا ہے، کتنا پیارا بچہ ہے"۔ کاجل نے بہو کو اپنی باہنوں میں اٹھا کر چمکارتے ہوئے کہا: "چلو اب میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ، آج تم سے مٹھائی کھا کر ہی جاؤں گی"۔

دونوں چل پڑیں۔

کچھ دیر بعد کمرے میں کافی پیتے ہوئے کاجل نے بڑی اپنائیت سے کہا "سچ کہتی ہوں پونم، آج تمہیں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ایسا لگتا ہی نہیں کہ چار سال بیت گئے"۔

"لیکن تمہیں دیکھ کر مجھے اتنی خوشی نہیں ہوئی کاجل، دیکھو تو ان چار سالوں میں کیا روپ بن گیا ہے تمہارا، چہرے کی ہڈیاں ابھر آئیں، آنکھیں دھنس گئی ہیں، گلاب جیسا رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔ جیسے میں کاجل کو نہیں اس کی شبیہہ دیکھ رہی ہوں"۔

"کیا کروں پونم، یہ میری تقدیر کا لکھا ہے، آج تک میں اپنا حال کسی سے نہیں کہا۔ دنیا والوں نے مجھے شاید جیتا جاگتا انسان سمجھا ہی نہیں، میں ان کے حق میں روپے بنانے والی آٹومیٹک مشین بن گئی ہوں"۔

"نہیں کاجل تم مشین کبھی نہیں ہو — اگر تم مشین ہوتیں تو تمہاری دیکھ ریکھ بھی ہوتی۔ یہ تمہاری بزدلی ہے۔ پہلے تمہارے اپنے ماں باپ نوچ کھاتے رہے اور اب سسرال والے نوچ رہے ہیں۔ دیکھو کاجل، اپنا حق کبھی پلیٹ پر سجا ہوا نہیں ملتا اس کے لئے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ بتاؤ آخر تم اسی طرح کب تک گھٹ گھٹ کر اپنی جان ہلکان کرتی رہو گی"۔

"تم ٹھیک کہتی ہو پونم، مجھے اپنے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا، بھگوان میری مدد کرے۔
اچھا اب اجازت دو پھر ملوں گی۔"
وہ اسی ادھیڑ بن میں گھر چلی گئی۔

—•—

آج پہلی تاریخ تھی، تنخواہ کا دن، کاجل دفتر سے آئی اور کپڑے بدل کر باتھ روم میں ہاتھ منہ دھونے چلی گئی۔ وہ باتھ روم سے باہر آئی تو نوین کی چھوٹی بہن پشپا آکر کاجل سے بولی۔
"بھابی آپ کو ماں بلا رہی ہیں۔"
"کہو ـــ آرہی ہوں۔"
پشپا چلی گئی تو وہ سر جھکا کر ماں کے پاس گئی۔
ماں نے قدرے نرم لہجہ میں کہا۔ "بہو آج تنخواہ مل گئی نا؟"
"مل گئی ماں جی، لیکن اس بار میں آپ کو تنخواہ نہیں دے سکونگی۔"
"کیوں ـــ؟ پھر گھر کیسے چلے گا؟"
"جیسے میرے یہاں آنے سے پہلے چلتا تھا۔"
کاجل کا غیر متوقع جواب سنکر ساس دنگ رہ گئی اور مارے غصہ کے اسے سر پاؤں تک دیکھنے لگیں۔ کاجل نے آج مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ مزید ظلم برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی پھر سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر کیا تھا ایک طوفان مچ گیا۔
ماں ادھر بڑبڑا رہی تھیں اور نوین پر برس رہی تھیں لیکن نوین گونگے کا گڑ کھائے چپ چاپ بیٹھا بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا آخر ماں چیخ چیخ کر خاموش ہوگئیں تو وہ اٹھ کر آہستہ سے کاجل کے پاس گیا اور نہایت سنجیدگی سے کہا۔
"کاجل، آج جو کچھ ہوا، اچھا ہی ہوا، ایسا ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔

کسی بات کی ایک حد ہوتی ہے"۔

آج اپنے شوہر کے منھ سے انصاف کے دو بول سنکر کاجل کی گھنیری پلکوں پر سکون و راحت کے آنسو بے اختیار جھلملا اٹھے۔ اور جذبات سے مغلوب ہو کر دونوں کی محبت پاش نگاہیں آپس میں بغل گیر ہو گئیں۔

بات کہاں ٹھہری

اس نوجوان کو میں کوئی ایک ہفتہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہاں اسپتال کے گیٹ کے قریب گویا میرے ہی انتظار میں کھڑا رہتا تھا اور جب تک میں اسپتال کے اندر داخل نہیں ہو جاتا وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔

آج نہ جانے کیوں میرے دل میں ہمدردی کا ایک موہوم جذبہ یکایک ابھرا۔ میں ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ میرے ہلتے ہاتھ کو دیکھ کر اس کے گرد آلود چہرے پر یکبارگی بدحواسی کی نمایاں جھلک عود کر آئی۔ وہ کبھی مجھے دیکھتا کبھی اپنا سر جھکا لیتا میں نے اپنا اسکوٹر برآمدے میں رکھ کر اسپتال کے چوکیدار سے کہا۔

"دیکھو، وہ نیم کے پیڑ کے نیچے جو شخص کھڑا ہے اسے بلاؤ۔"

یہ کہکر میں دفتر کے اندر چلا گیا۔ چنداں توقف کے بعد وہ ہچکچاتے ہوئے بمشکل تمام دفتر میں داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی ادب سے سلام کیا۔

میرے دریافت کرنے سے پہلے ہی اس نے اپنا مدعا بیان کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب، میں نے سنا ہے یہاں مردوں کا آپریشن ہوتا ہے۔

"ہاں ہوتا ہے صرف مردوں کا ہی نہیں عورتوں کا بھی۔" میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اب عام لوگ بھی خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔

ہاں، ٹھیک میرے محلہ کی دو عورتوں نے بھی اپنا آپریشن کرایا ہے انہیں

ایک ایک ساڑی اور پچاس روپے ملے تھے"۔ اس نے کچھ عجیب للچائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔
میں نے اس کی مزید معلومات کیلئے واضح طور پر سمجھایا کہ عورتوں کو ایک ساڑی اور پچاس روپے اور مردوں کو ایک دھوتی اور پچاس روپے دیئے جاتے ہیں۔
کیا تم بھی اپنا آپریشن کراؤ گے؟" میں نے اس کا مقصد دریافت کیا۔
"جی ہاں۔ میں اپنا آپریشن کرانا چاہتا ہوں"
"اچھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"
"دھرم دیو" اس کا جواب تھا۔
"تمہاری عمر؟"
"تیس سال۔ میرے بچے بھی ہیں صاحب۔"
"تم کہاں رہتے ہو؟"
"جگ سلائی میں"
"تم اپنی مرضی سے آپریشن کرانا چاہتے ہو یا تمہیں کسی نے بہکایا ہے؟"
"نہیں صاحب، غریب آدمی ہوں بال بچوں والا۔ آجکل مزدوری بھی ٹھیک سے نہیں ملتی۔ جان لیوا مہنگائی میں بال بچوں کا پیٹ پالنا مشکل ہے۔"
"ٹھیک ہے تمہارا آپریشن ہو جائے گا۔"
میں نے ضروری فارم پر اس کا نام اور پتہ لکھ لیا۔ جب اسے فارم پر دستخط کرنے کے لئے کہا تو وہ نہایت انکساری سے بولا۔
"مجھے دھوتی کے بجائے ساڑی دیجئے گا صاحب، دیکھئے دھوتی میرے پاس ہے"
وہ اپنی میلی کچیلی دھوتی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔
"ساڑی مردوں کو نہیں دی جاتی دھرم دیو" میں نے اسے سمجھایا۔
"آپ چاہیں تو دے سکتے ہیں صاحب"
"نہیں دے سکتا" میں نے قدرے تلخ لہجہ میں کہا۔ "سرکاری [illegible] کاموں میں بے قاعدگی بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے سمجھے۔"

"نہیں صاحب، آپ مالک ہیں، آپکے اختیار میں ہے"۔

"نہیں دھرم دیو، ایسا نہیں ہو سکتا، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو" البتہ تم ایک کام کر سکتے ہو، دھوتی بیچ کر ساڑی خرید لو۔"

"نہیں حضور میں غریب آدمی ہوں، ایشور کے لئے، مجھ پر رحم کیجیے"

"دیکھو فضول خدمت کرو، میرا دماغ مت چالو، اگر تمہیں آپریشن کرانا ہو تو کراؤ ورنہ واپس جاؤ"۔ میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

"ایسا مت کیجیے صاحب" وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اپنے اوپر قابو پا کر کہا۔" اچھا صاحب آپ کی مرضی"۔

"مرضی کا سوال نہیں یہ قانونی مسئلہ ہے"۔

"اچھا صاحب، کیا میں آپریشن کے دوسرے دن کام پر جا سکتا ہوں؟"

"نہیں۔ تمہیں کم از کم ایک ہفتہ آرام کرنا چاہیئے"۔

"ہماری قسمت میں آرام کہاں ڈاکٹر صاحب، ہم غریبوں کیلئے آرام حرام ہے۔ کماؤ تو کھاؤ ورنہ فاقہ کرو"۔

"کیوں تمہارا اور کوئی نہیں ہے؟"

"ایک چھوٹا بھائی تھا وہ کبھی بھاگ گیا"۔

"کیوں نہیں اپنی بیوی کا آپریشن کرا لیتے ہو؟"

"وہ آپریشن نہیں کرائے گی صاحب ڈرتی ہے"۔

"اس میں ڈرنے کی کیا وجہ ہے، ویسے تو تمہارے محلہ کی کئی عورتوں نے آپریشن کرایا ہے"۔

"نہیں صاحب، میری بیوی آپریشن نہیں کرائے گی۔ وہ باہر نکلنے میں شرماتی ہے"۔

"اچھا تو میں تمہارے گھر اپنا آدمی بھیجدوں گا۔ وہ تمہاری بیوی کو اچھی طرح سمجھا دے گا، تم جگسلائی میں رہتے ہو نا؟"

"جی ہاں، لیکن میرے گھر کسی کو مت بھیجئے گا صاحب، میری بیوی کسی غیر آدمی سے بات نہیں کرتی۔"

"پھر کیسے آپریشن ہو گا؟"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں میرا آپریشن کر دیجئے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، تم ہی آپریشن کرالو، لیکن یاد رکھو تمھیں ساڑی نہیں ملے گی، ساڑی صرف عورتوں کو ہی دی جاتی ہے۔"

"ایک ساڑی دینے میں کیا دشواری ہے صاحب؟"

"پھر وہی رٹ لگاتے ہو، بھئی اب تم یہاں سے جاؤ، میں تم سے باز آیا، تمہارا آپریشن نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں حضور معاف کیجئے، مجھ سے غلطی ہو گئی۔" اس کے شرابور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد دبی زبان میں کہا۔ "آپ ہی آکر میری بیوی کو سمجھا دیجئے، آپ ڈاکٹر ہیں، وہ آپ کی بات ضرور مان لے گی۔"

"کسی کے گھر جانا میرا کام نہیں ہے۔"

"بھگوان کی خاطر مجھ پر ترس کھائیے صاحب، آپ کبھی کبھی میرے گھر کے سامنے سے گزرتے ہیں، تھوڑا سا وقت نکال کر آجائیے آپ کا احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"توبہ توبہ، تمہیں بلا کر میں نے ایک مصیبت مول لی۔"

میرے ناگوار لہجہ پر وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

چند لمحوں کیلئے ماحول پر خاموشی چھائی رہی، پھر نہ جانے کیوں میرا سخت دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے قدرے نرمی سے کہا۔ "اچھا جاؤ، کل شام کو ساڑھے چھ بجے میرا انتظار کرنا۔"

"اچھا حضور" اس نے ممنونیت بھرے جذبات میں مجھے سلام کیا اور سر جھکائے دبے قدموں سے باہر چلا گیا۔

شام کو گھر آیا تو میں عجیب الجھن میں مبتلا تھا۔ میں نے اب تک کئی آپریشن کئے لیکن ایسے بد دماغ آدمی سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس رات میں سکون کی نیند کبھی نہیں سو سکا۔ ایک معمولی سے آپریشن کے لئے، اس کے پیچیدہ سوال و جواب ساری رات میرے ذہن میں نشتر زنی کرتے رہے۔

دن ڈھلے جیسے جیسے چھٹی کا وقت قریب آرہا تھا اس شخص کی احمقانہ باتیں میرے ذہن کے گوشوں سے ابھر رہی تھیں۔ جب انتظار کی صبر آزما گھڑیاں ختم ہو چکیں تو میں دفتر سے نکلا اور اسکوٹر سے فوراً چل پڑا۔ جب جگلائی کے احاطے میں داخل ہوا تو میری متجسس نظریں راستہ کے دونوں فٹ پاتھوں پر گزرنے والے راہگیروں کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ بنیان اور دھوتی پہنا ہوا جو بھی شخص دکھائی پڑتا میں اسے غور سے دیکھنے لگتا۔ کوئی تیس چالیس میٹر طے کرنے کے بعد میری نظریں ایک دکان پر پڑیں۔ دکان پر ایک شخص بنیان اور دھوتی پہنے بیڑی کا دم لگا رہا تھا۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی وہی دھرم دیو تھا۔ قریب جاکر میں نے اپنا اسکوٹر روک دیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس کا فکر مند چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ذہنی پریشانی کی وجہ سے رات بھر نہیں سو سکا تھا۔ اس نے اخلاقاً مجھے سلام کیا اور سامنے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ نل کے پاس جو کھپریل کا مکان ہے، وہی میرا گھر ہے۔"

وہ مجھے اپنے گھر کی طرف لے گیا۔ مجھے دیکھ کر نل پر کھڑی عورتیں اپنا رخ موڑ کر آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔

میں نے اس کے گھر کے سامنے اسکوٹر کھڑا کر کے کہا "چلو تمہاری بیوی سے ملا جائے۔"

اس نے بے ساختہ جواب دیا "ڈاکٹر صاحب کل رات میں نے اس سے کہا تھا لیکن وہ کسی غیر آدمی سے بات کرنا نہیں چاہتی۔"

"ارے تم کیسے گھن چکر آدمی ہو، کل کہہ رہے تھے کہ وہ میری بات مان لے گی اور آج کچھ اور کہہ رہے ہو۔"

"ڈاکٹر صاحب، آخر اس سے بات کر کے کیا کیجیے گا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "آپریشن میں کراؤں گا۔"

"تم بڑے فالتو آدمی ہو، جاؤ تمہارا آپریشن نہیں ہوگا" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا اور . . . . .

اس سے پہلے کہ میں لوٹ جاتا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔ "ذرا ٹھہر جائیے ڈاکٹر صاحب"۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے آواز دی۔

"اندر آجائیے صاحب"۔

اس کے ساتھ ہی ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ "کس کو بلا رہے ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب کو"، یہ دھرم دیو کی آواز تھی۔

"ارے! کیوں بلا رہے ہو؟" وہی نسوانی آواز تھی جس میں مزاحمت کا انداز تھا۔

"چپ رہو"۔ دھرم دیو فوراً باہر نکلا اور مجھے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں ہکا بکا سا رہ گیا۔ میری نظر ایک دھان پان سی حسین دوشیزہ پر پڑی، وہ ایک پھٹی پرانی ساڑی میں لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بار حیا سے فوراً ایک کونے میں سمٹ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی پھٹی ساڑی کے انگنت شگافوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ جب اپنے دھڑکتے سینے کے تموج کو چھپانا چاہا تو نیچے اس کی پنڈلیاں ننگی ہو گئیں۔ جب پنڈلیوں کو ڈھکنا چاہا تو اس کھینچا تانی میں ساڑی مزید پھٹ گئی اور اس کا گورا بدن نیم عریاں ہو گیا۔ وہ باؤلی سی ہو گئی آخر بے بسی کے عالم میں بے ضبط ہو کر وہ رونے کے انداز میں یکلخت چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی،

اس لڑکی کی بے بسی کا حیا سوز منظر دیکھکر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا، اور اس کم ظرف شخص کی ذلیل حرکت پر مجھے اس قدر غصہ آیا کہ اس کے گلے میں ہاتھ دے کر پیچھے ڈھکیل دیا۔ وہ زمین پر چاروں خانے چت گر پڑا۔ اسے برا بھلا کہتے ہوئے باہر جانے لگا تو وہ میرے پاؤں پکڑ کر گڑ گڑانے لگا۔

"معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب، بھگوان کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ سے جو کچھ کہا سب جھوٹ تھا۔ یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ میں اسی کیلئے آپ سے ساڑی مانگ رہا تھا، تہوار میں پہننے کیلئے۔

(موکوزی خیال بنگلہ افسانہ سے)

خط کا کرب

بجنی کافی دیر سے ریاض کے انتظار میں پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی ریاض کو گاڑی سے اترتے دیکھا وہ بے اختیار دوڑ پڑا اور اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ ریاض بجنی کا پرانا دوست تھا اور دونوں حیدرآباد میں ایک عرصہ تک ہم جماعت رہے تھے۔

بجنی مسکراتے ہوئے بولا "میں کافی دیر سے تمہارے انتظار میں کھڑا تھا۔"

"گاڑی دو گھنٹے لیٹ تھی۔ ریلوے کا محکمہ بھی عجیب مصیبت ہے بھائی، سچ کہتا ہوں، آج کل گاڑی کے سفر میں طبیعت بور ہو جاتی ہے۔" ریاض نہایت پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "خیر تم کیسے ہو؟"

"اچھا ہوں، اللہ کا کرم ہے۔" بجنی ریاض کا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے بولا۔ "چلو ٹیکسی کر لیں" دونوں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔

جب گھر پہونچے تو بجنی اور اسکی دو بہنیں شکیلہ اور جمیلہ ریاض کو ایک مدت کے بعد دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

بجنی کی ماں نے کہا "ریاض تم بہت دور سے تھکے ماندے آئے ہو غسل وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ، پھر باتیں کریں گے۔"

ریاض غسل کرنے کے بعد شام کی چائے پی کر بجنی کیساتھ بازار کی طرف تفریحاً چلا گیا

رات کے کھانے پر سب ایک ساتھ بیٹھے تھے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بجمی کی ماں بہت خوش اخلاق خاتون تھیں۔ ریاض کو باتوں باتوں میں خوب ہنساتی رہیں۔ شکیلہ اور جمیلہ بھی دلکش صحبت کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ دونوں بہنیں انٹرنس میں پڑھتی تھیں۔ جمیلہ جسقدر صبیح تھی شکیلہ اسی قدر ملیح تھی اور ناک نقشہ کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جمیلہ بہت عمدہ فنکارہ تھی اور دستکاری کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اور شکیلہ شاعرہ تھی اور کچھ شوخ طبیعت پائی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب اٹھے تو بجمی اور ریاض باغ میں ٹہلنے چلے گئے اور بجمی کی ماں نے لڑکیوں سے کہا "بجمی کے کمرے میں ریاض کا بھی بستر لگا دو، غریب تھکا ماندہ آیا ہے۔"

مسکراتی چاندنی میں ننھے ننھے خوش رنگ اور دلکش پھولوں کے درمیان چھوٹی سی بنچ پر بجمی اور ریاض بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بجمی جمشید پور کی خصوصیات پر روشنی ڈال رہا تھا۔ ٹاٹا کمپنی میں کس طرح فولاد تیار ہوتا ہے، موٹریں بنتی ہیں، مٹی کھودنے کے کرین تیار ہوتے ہیں اور جوبلی پارک کی دلکشی اور نظر فریب مناظر کی تعریفیں اس طرح کر رہا تھا جیسے جمشید پور شہر نہیں ایک عارضی جنت ہے۔ ریاض اسکی باتوں میں کھو سا گیا تھا۔ معًا اس نے کسی کی نغمہ ریز آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو پیچھے شکیلہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دونوں کو اپنی طرف مخاطب دیکھکر اس نے کہا۔ "آپ لوگوں کے بستر لگا دیئے گئے ہیں۔ امی بلا رہی ہیں۔" شکیلہ کے مخروطی ہونٹوں پر تبسم ناچ رہا تھا۔ "آپ کے دوست تھکے ماندے آگئے ہیں وہ یقینًا پریشان ہونگے۔"

"اچھا تم جاؤ، ہم آرہے ہیں۔"

بجمی اور ریاض اٹھکر حوض کے کنارے چلے گئے اور سگریٹ سلگا کر کچھ دیر ٹہلتے رہے پھر اپنے کمرے میں چلے آئے۔

سات دن کے مختصر عرصہ میں بجمی کے گھر والے ریاض سے اس قدر گھل مل گئے جیسے وہ کبھی ان کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ جمیلہ کے برتاؤ میں انتہائی سنجیدگی اور خلوص تھا۔ اس کے برعکس شکیلہ ریاض سے اس درجہ بے تکلف ہو گئی تھی کہ اپنا بیشتر وقت اسے اپنی غزل سنانے میں گذارتی۔ اگرچہ اس کی گفتگو میں جھنکاردار قہقہے ہوتے اور ہر ادا دلکش ہوتی۔ پر جمیلہ کی ایک سنجیدہ مسکراہٹ اس پر سبقت لے جاتی۔

بجمی نے آج صبح ہی پکچر دیکھنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے سب تیار ہو گئے۔ ریاض آئینہ کے سامنے اپنے بال سنوار رہا تھا کہ شکیلہ اس کے پیچھے کھڑی ہو کر یکبارگی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس بے موقع ہنسی پر ریاض جھینپ سا گیا۔

شکیلہ ایک عجیب توبہ شکن ادا سے بولی "خوشبو لگائیے گا؟"

ریاض مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"دیکھئے، میں نے کتنا عمدہ سینٹ لگایا ہے۔"

ریاض جیسے ہی خوشبو سونگھنے کے لئے جھکا، شکیلہ کے لب اس کے گال سے مس ہو گئے۔ وہ چونک اٹھا اس کا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا اور فوراً آئینہ کے سامنے سے ہٹ گیا جیسے ہی وہ مڑا اس کی نظر جمیلہ پر پڑی جو دروازے تک آکر واپس جارہی تھی۔

اس غیر متوقع حادثہ نے ریاض کو ایک عجیب الجھن میں ڈالدیا۔ وہ دوسرے کمرے میں جاکر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں عجیب عجیب خیالات لہراتے اور مٹتے جارہے تھے۔ اتنے میں بجمی نے آواز دی۔ ریاض اپنی الجھن کو قابو میں کرتے ہوئے فوراً اٹھا اور بجمی کے ساتھ ہولیا۔ پکچر کا وقت ہو رہا تھا۔ سب چائے پر بیٹھ گئے۔ چائے کی چسکیوں کے ساتھ ریاض کے دل میں خوف اور ندامت چٹکیاں لے رہی تھی۔ لیکن بعد میں اسے اطمینان ہو گیا کہ اس حادثہ کا علم کسی کو نہیں۔ مگر جمیلہ کی غیر معمولی خاموشی میں اسے ایک عجیب اضطراب محسوس ہو رہا تھا۔

ریاض جمشید پور کی رنگینیوں اور دلفریبیوں میں اس درجہ کھو گیا تھا کہ اسے یہ احساس بھی نہ ہو سکا کہ اس کی چھٹیاں ختم ہونے کو آگئیں۔ صرف چار دن باقی رہ گئے تھے۔ وہ ایک کش مکش میں مبتلا تھا۔ شکیلا اس کے دل کی گہرائیوں میں بسنے کے لئے بے قرار ہوئے جا رہی تھی۔ لیکن وہ جمیلہ کے خلوص و محبت کے زیر اثر بے چین تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ریاض صوفہ پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا اتنے میں جمیلا اپنی کشیدہ کاری کی کتاب لینے کے لئے کمرے میں آئی تو ریاض نے کہا۔

"جمیلا اب میری چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں۔ مجھے پرسوں حیدرآباد چلا جانا ہو گا۔"

"نہیں، آپ غلط کہہ رہے ہیں شاید آپ اب جمشید پور سے اکتا گئے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے جمیلا، میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے پیر کے دن دفتر میں حاضری دینی ہوگی لیکن ویسے جمشید پور بڑی خوبصورت جگہ ہے۔۔ جی چاہتا ہے۔ یہیں بس رہوں۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن کیا ۔۔۔؟" جمیلہ سوالیہ نشان بن گئی۔

"جمشید پور سے بہت کچھ لینا چاہتا تھا مگر نہیں لے سکا۔ شاید یہ میری بدقسمتی ہے۔"

"یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔" جمیلہ نے ایک نسوانی ادا سے کہا۔

"غلط فہمی ۔۔!" ریاض کے شگفتہ چہرے پر مایوسیوں کی آڑی ترچھی لکیریں بجھ گئیں۔"

"جی ہاں ؟" یہ آپ کی سراسر غلط فہمی ہے۔ دراصل آپ ایک لڑکی کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے۔" جمیلہ کی آواز وفور جذبات سے کپکپا سی گئی اور فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ریاض یکلخت تڑپ سا گیا۔ وہ سمجھا اس کی تمنائیں روند دی گئیں۔ دراصل یہی اسکی غلط فہمی تھی اور سچ مچ وہ اس کے جذبات کو پڑھ

نہیں سکا۔ وہ ایک عمیق سوچ میں کھو گیا اور وہیں گھنٹوں بیٹھا رہا۔
جمشید پور چھوڑنے کی دھمکی دیکر ریاض کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ وہ ان گنت غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا۔ شام کی چائے پر نجمی کی ماں نے بلایا تو وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے جوبلی پارک کی طرف چلا گیا۔ تنہا بیٹھے بیٹھے وہاں بھی اس کی طبیعت نہیں لگی تو بازار کی گہما گہمی میں چلا آیا اور ساکچی سوڈا فاؤنٹین میں بیٹھ کر دو گھنٹہ تک کولڈ ڈرنک کے ٹھنڈے گلاسوں میں آنسو گھولتا رہا۔ جب آٹھ بج چکے تب گھر واپس آیا۔ غیر متوقع دیر سے آنے پر نجمی نے چنداں تعجب سے پوچھا۔
"کیوں بھئی ریاض، اتنی دیر تک کہاں رہ گئے تھے؟"
"آج طبیعت کچھ گراں سی محسوس ہو رہی تھی اس لئے باہر چلا گیا تھا۔"
"نہیں تم جھوٹ کہہ رہے ہو، شاید کوئی یاد آ رہا ہے۔"
ریاض کو ایسا لگا کہ نجمی نے اس کی روح کے تاروں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ کچھ نہیں بول سکا اور چپ چاپ سو گیا۔
نجمی نے پھر ایک شگفتہ چٹکی لی "تمہیں میری قسم بتاؤ ریاض، میں دیکھ رہا ہوں دو ایک دن سے تم کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔ شاید مجھ سے یا میرے گھر والوں سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ اگر واقعی یہ بات ہے تو میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دوست کی بھول کو جو انجانے پن میں ہو گئی ہو نظر انداز کر دو گے۔"
"نہیں میرے دوست" ریاض کی آواز یکبارگی گلوگیر ہو گئی "سچی بات یہ ہے کہ کل مجھے جمشید پور چھوڑ دینا ہو گا، تمہاری محبت اور خلوص، تمہاری ماں کی شفقت اور تمہاری بہنوں کی ہمدردیاں میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"
"یہ دنیا ہے ریاض" نجمی ایک تجربہ کار آدمی کی طرح بڑی سنجیدگی سے بولا "انسان کو اسقدر کمزور دل نہیں ہونا چاہیے۔"
یونہی وہ باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

—— • ——

گاڑی رات کی کاجل جیسی تاریکی میں روشنی کا ایک دریا بہاتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ ریاض کے دل میں عجیب عجیب خیالات گاڑی کے پہیوں کی مانند گھوم رہے تھے۔ وہ عجیب بے قراری کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ جمشید پور ویسے ٹاٹا کمپنی کا فولاد کا کارخانہ ہے اور جوبلی پارک دیکھنے گیا تھا لیکن اس سفر سے جو حاصل ہوا وہ کسی کی پاک اور بے لوث ہمدردیوں کا بے بہا خزانہ ہے۔ واقعی عورت ایک اچھوتی کلی ہے۔ ایک ایسا نازک و لطیف آبگینہ ہے جو معمولی حرارت سے پگھل جاتا اور ذراسی چوٹ سے ٹوٹ جاتا ہو——"

وہ اسی کشمکش میں کھویا ہوا سگریٹ پر سگریٹ پئے جارہا تھا۔ جب سگریٹ کیس خالی ہوگیا تو اس نے سگریٹ کا دوسرا ڈبہ نکالنے کے لیے، سوٹ کیس کھولا تو سوٹ کیس میں ایک خوبصورت لفافہ دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہوگیا۔ فوراً لفافہ کھول کر دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جھیل کی سی صاف شفاف آنکھوں میں معصومیت کے آنسو روکے ہوئے کہہ رہا ہے۔۔۔!"

بھائی ریاض!

سچ کہتی ہوں کہ آپکی یہ مختصر سی صحبت نے میرے دل کی اداس یادوں کو ہنسا دیا آپ ہمارے غریب خانے میں جب تک تشریف فرما گئے میں ایک غیر مرئی محبت اور اجڑی ہوئی مسرت کو پا گئی تھی۔ خدا لگتی کہتی ہوں آپکا چہرہ بشرہ اور انداز گفتگو میرے بڑے بھائی جمیل اختر سے ہو بہو ملتا ہے۔ جو مادر وطن کے آبرو کے تحفظ کی خاطر سیفا کے محاذ جنگ پر جاکر واپس نہیں آیا۔ کیا اچھا ہوتا آپ بھی جمشید پور چلے آتے میں اپنے بھائی کو پالیتی۔

بہر کیف میرے ریاض بھائی! آپ پھر کب جمشید پور کی بوقلمونیوں اور رنگا رنگینیوں کی کیف زار زندگی میں تشریف لائیے گا مجھے آپ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

آپکی بہن: جمیلہ خالوق

نام : خواجہ عبدالرزاق

پیدائش : ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء ، کھڑگپور، مغربی بنگال

وفات : ۳۱ر مئی ۱۹۹۴ء

جمشیدپور، بہار

دُور کے پہاڑ

قبلہ خواجہ عبدالرزاق صاحب نے
خود ہی ترتیب دیا تھا
لیکن
ان کی علالت اور
میری مصروفیت کے باعث
تکمیل بھی نہ ہو پائی
اچانک
۳۱ر مئی ۱۹۹۴ء دوپہر ایک بجکر ۵۵ منٹ کا
وہ المناک منظر
اب بھی
میری آنکھوں میں محفوظ ہے
ان کی
ڈوبتی آنکھیں !
ٹوٹتی سانسیں اور
سرد پڑتی ہوئی نبض

میں بہت کچھ چاہتا تھا
مگر
کچھ بھی نہیں کر سکا
دیکھتے ہی دیکھتے ایک عہد ختم ہو گیا
موصوف کی
دیرینہ خواہش
تفکرات، احساسات
اور تجربات
"دور کے پہاڑ"
آپ کے ہاتھ میں ہے
امید ہے پسند آئے

مخلص
ناقد نظمی
جمشیدپور ۱۰/۶/۹۴